قرآن کریم اور سنت نبویہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کی تعلیمات کا علمبردار

بینات

جلد: ۸۲ شمارہ: ۱۲
ذوالحجہ: ۱۴۴۰ھ - اگست: ۲۰۱۹ء
قیمت فی شمارہ: ۴۰ روپے ، زرِ سالانہ: ۴۵۰ روپے

مدیر / مدیر مسئول
مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر

نائب مدیر
مولانا سید سلیمان یوسف بنوری

مدیر معاون
مولانا محمد اعجاز مصطفی

ناظم
مولانا فضل حق یوسفی

خط وکتابت اور ترسیل زر کا پتہ

دفتر ماہنامہ ''بینات'' جامعۃ العلوم الاسلامیۃ علامہ بنوری ٹاؤن
کراچی، پوسٹ کوڈ: 74800، پوسٹ بکس نمبر: 3465
فون دفتر ''بینات'': 021-34927233

اکاؤنٹ نمبر

اکاؤنٹ نمبر: 0101900-397-7 برانچ کوڈ: 00816
مسلم کمرشل بینک علامہ بنوری ٹاؤن برانچ کراچی

بیرون ملک سے بذریعہ ہوائی ڈاک

ریاست ہائے متحدہ امریکہ، جنوبی افریقہ، تھائی لینڈ، ناروے، ویسٹ انڈیز وغیرہ : 35 امریکی ڈالر
سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، مسقط، بحرین، عمان، ایران، انڈیا وغیرہ: 27 امریکی ڈالر
بنگلہ دیش: 25 امریکی ڈالر

جامعۃ العلوم الاسلامیۃ
علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن
فون: 34913570 - 34123366 - 34121152 Ext. 146 - 147
فیکس: 92-21-34919531 +
Web: www.banuri.edu.pk *Email*: bayyinat@banuri.edu.pk

ناشر: مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر مطبع: ایجوکیشنل پریس طابع: فیروز زکی

فہرستِ مضامین

بصائر و عبر

حفظِ قرآنِ کریم کیوں ضروری ہے؟!	۳	محمد اعجاز مصطفیٰ

مقالات و مضامین

حکومت کے اوصاف اور سربراہ کے فرائض	۱۷	محدث العصر علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ
سلسلۂ مکاتیب حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ	۲۰	انتخاب: مولانا سید سلیمان یوسف بنوری
اسلام اور سیکولرزم (قسط:۳)	۲۳	مفتی عبد الرؤف غزنوی
حضرت ابراہیم علیہ السلام - ایک برگزیدہ نبی اور رسول	۳۰	ڈاکٹر مفتی محمد نجیب قاسمی سنبھلی
شرعی عائلی احکام کی دفعہ بندی: قانونِ حضانت (قسط:۵)	۳۵	مفتی شعیب عالم
مذہبی القابات اور ہماری بے اعتدالیاں	۳۷	مولانا سید انور شاہ
جامعہ بنوری ٹاؤن کا تعلیمی منہج اور کردار...ایک تحقیقی مطالعہ (قسط:۳)	۴۷	ڈاکٹر مولانا انعام اللہ

دار الافتاء

المیزان انویسٹمنٹ میں سرمایہ کاری کرنا (اسلامک میوچل فنڈز اور اسٹاک مارکیٹ کے شیئرز کا حکم)	۶۰	ادارہ

نقد و نظر

	۶۴	ادارہ

حفظِ قرآنِ کریم کیوں ضروری ہے؟!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ وسلامٌ علٰی عبادہِ الذین اصطفٰی

گزشتہ دنوں محترم جناب عبدالرؤف ملک صاحب (لاہور) کی طرف سے ایک خط موصول ہوا، جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ ماہنامہ ’’اشراق‘‘ کے جون ۲۰۱۹ء کے شمارہ میں ایک مضمون ’’قرآن کریم پرنظر کی ضرورت‘‘ کے عنوان سے چھپا ہے، جو انتہائی دل آزاری کا سبب ہوا، یہ مضمون آپ کی خدمت میں ارسال کیا جارہا ہے، اس پر غور فرمالیں۔ راقم الحروف نے وہ مضمون پڑھا، اس کے متعلق چندگزارشات پیش کرنے کی جسارت کررہا ہے۔

محترم! جمہور علماء اہل سنت والجماعت کے نزدیک اتنا قرآن کریم حفظ کرنا جس سے نماز ادا ہوجائے، ہر مسلمان عاقل بالغ پر فرض ہے اور مکمل قرآن کریم حفظ کرنا فرضِ کفایہ اور باعثِ اجر وثواب ہے۔ اگر کوئی بھی مسلمان حافظِ قرآن نہ رہے تو تمام عالم کے مسلمان گناہ گار ہوں گے۔ ڈاکٹر عرفان شہزاد صاحب کا پورا مضمون پڑھنے سے ایک عام آدمی بھی یہی تأثر لیتا اور محسوس کرتا ہے کہ یہ مضمون تضادات کا مجموعہ ہے اور اس میں کوئی بات واقعی، حقیقی اور تحقیقی نہیں، اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود قرآن کریم حفظ کیا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس کی ترغیب دی، بلکہ جو شخص ایمان لاتا اول آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کو قرآن کریم سکھاتے اور پھر وہ قرآن سیکھنے کے بعد اوروں کو سکھاتا اور حفظ کراتا، جس کی بنا پر ہزاروں صحابہ رضی اللہ عنہم قرآن کریم کے حافظ بنے۔ ایک غزوہ میں ستر قاری شہید ہوئے اور جنگِ یمامہ

میں سات سو قرآن کریم کے حافظ شہید ہوئے، جس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ: ''قرآن کریم کو کتابی صورت میں بھی محفوظ کرائیے، اس طرح حفاظ شہید ہوتے رہے تو کہیں قرآن کریم ہی نہ اُٹھ جائے۔'' جس کے بعد قرآن کریم کو حفظ کے ساتھ ساتھ کتابی صورت میں بھی جمع کیا گیا اور کیا جاتا رہا۔ امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ تفسیرِ قرطبی کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''لاخلاف بین الأمة ولابین أئمة أهل السنة : أن القرآن اسم لکلام اللّٰه تعالٰی الذی جاء به محمد صلی اللّٰه علیه وسلم معجزة لهٗ وأنهٗ محفوظ فی الصدور مقروء بالألسنة مکتوب فی المصاحف.....'' (تفسیر قرطبیؒ، ج:۱،ص:۸۰)

''اُمت اور اہلِ سنت کے ائمہ کے درمیان اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کے اس کلام کا نام ہے جسے حضرت محمد ﷺ بطور معجزہ لائے ہیں اور وہ سینوں میں محفوظ ہے، زبانوں سے پڑھا جاتا ہے اور مصاحف میں لکھا ہوا ہے۔''

یہ بات تو صاحبِ مضمون بھی جانتا اور اس کا اعتراف کرتا ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام حضور اکرم ﷺ سے قرآن کریم کا دور کیا کرتے تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا یہ دور الفاظِ قرآن اور حفظِ قرآن کا تھا یا نہیں تھا؟ پھر اس نے لکھا کہ: ''صحابہ کرامؓ اس لیے قرآن کریم یاد کرتے تھے کہ اس وقت قرآن کریم محفوظ کرنے کا ذریعہ صرف یہی تھا۔'' گویا اس نے اتنا مان لیا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی قرآن کریم یاد کرتے تھے اور یہ حفاظتِ قرآن کا ذریعہ تھا۔ دنیا جانتی ہے کہ آج بھی حفاظتِ قرآن کا محفوظ ذریعہ حفظِ قرآن ہی ہے۔ اگرچہ اس کی یہ بات بھی محلِ نظر ہے کہ ''وہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے، اس لیے قرآن کریم یاد کرتے تھے'' کیونکہ صحابہ کرامؓ لکھنا پڑھنا سیکھ چکے تھے، تب ہی تو قرآن کریم کے کاتبین بنے۔ اب اگر قرآن کریم کا یاد کرنا مقاصد میں سے نہیں تھا اور اس پر کوئی اجروثواب نہیں ملتا تھا تو قرآن کریم لکھنے والے صحابہ کرامؓ تو موجود تھے، پھر یہ حفظ اور یاد کرنے کی بقول اس کے ''صعوبت'' کیوں جھیلتے تھے؟! صاحبِ مضمون نے صرف اس پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ وہ قرآن کریم حفظ کرنے کو ''رسم، بدعت، کشٹ، غیرمقصودی چیز، محض بڑوں کی خوشنودی، جبر اور خوف کا نتیجہ، غیرصحت مند رویے تشکیل دینے کا سبب، حفاظ بچوں میں غیرصحت مند رویوں کے اثرات کا پیدا ہوجانا، ذہنی صلاحیتوں کی نشوونما میں رکاوٹ اور تعلیمی نقطۂ نظر سے بالکل نامناسب'' کہتا ہے، گویا ان کے نزدیک قرآن کریم حفظ کرنا فضول، اس کے الفاظ رٹنا، حماقت، دماغ سوزی اور تضییعِ اوقات ہے۔ **نعوذ باللّٰه من ذٰلک.**

راقم الحروف سمجھتا ہے کہ یہ باتیں وہ آدمی کرسکتا ہے جو خوفِ خدا، فکرِ آخرت، اسلامی معاشرہ

اور روحِ اسلام سے ناواقف ہو یا اسلام سے آزادی کا خواہاں اور اتباعِ نفس کا مریض ہو، ورنہ ایک سمجھ بوجھ رکھنے والا مسلمان آدمی اس طرح کی باتیں نہیں کرسکتا۔

قرآن کریم کے حفظ کا ثبوت' قرآن کریم، صحیح احادیث اور چودہ صدیوں سے اُمتِ مسلمہ کے عملی تواتر سے ثابت ہے۔ سب سے پہلے حفظِ قرآن پر دلالت کرنے والی چند آیات ملاحظہ فرمائیں:

۱:-''سَنُقْرِئُکَ فَلَا تَنْسٰی .'' (الاعلیٰ:۶)

''ہم آپ کو پڑھائیں گے، آپ بھول نہیں پائیں گے۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم کے نزول کے مقاصد میں سے اُسے حفظ کرنا اور یاد کرنا بھی ہے۔

۲:-''وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَیْهِ الْقُرْءَ انُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً کَذٰلِکَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَکَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِیْلًا.'' (الفرقان:۳۲)

''اور کہنے لگے وہ لوگ جو منکر ہیں کیوں نہ اُترا اس پر قرآن سارا (اکٹھا) ایک جگہ ہوکر (ایک بار) اسی طرح اتارا، تاکہ ثابت رکھیں ہم اس سے تیرا دل اور پڑھ سنایا ہم نے اس کو ٹھہر ٹھہر کر۔''

معلوم ہوا کہ قرآن کریم کو تھوڑا تھوڑا اس لیے اُتارا جاتا تھا، تاکہ آپ اسے آسانی سے یاد کرسکیں۔

۳:-''اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْءَ انَهٗ فَاِذَا قَرَأْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْءَ انَهٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ .''(القیامۃ:۱۷،۱۸،۱۹)

''وہ تو ہمارا ذمہ ہے اس کو جمع کرنا (کردینا) تیرے سینہ میں اور پڑھنا تیری زبان سے، پھر جب ہم پڑھنے لگیں فرشتہ کی زبانی تو ساتھ رہ اس کے پڑھنے کے، پھر مقرر ہمارا ذمہ ہے اس کو کھول کر بتلانا۔''

اس آیت سے بھی معلوم ہوا کہ قرآن کریم کو حفظ کرنا اور اس کو پڑھنا بھی قرآن کریم کے مقاصد میں سے ہے۔

۴:-''اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ .'' (الحجر:۹)

''ہم نے آپ پر اُتاری ہے یہ نصیحت اور ہم آپ اس کے نگہبان ہیں۔''

قرآن کریم کی حفاظت سے مراد اس کے الفاظ اور معانی دونوں کی حفاظت ہے۔ کیونکہ اس آیت میں ''لَحٰفِظُوْنَ'' مطلق لایا گیا ہے، جس سے اُصولِ عربیت کے مطابق حفاظت کا فردِ کامل مراد لیا جانا ضروری ہے اور حفاظتِ کاملہ وہی ہے جو لفظ اور معنی دونوں کو شامل ہو۔ اُمت میں تا قیامت ایسے

حفاظِ قرآن پیدا ہوتے رہیں گے جو اس کے ہر حرف اور معنی کی حفاظت کرتے رہیں گے۔

تفسیرِ قرطبی میں امام قرطبیؒ نے اسی آیت کے تحت یحییٰ بن اکثم رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے ایک واقعہ نقل کیا ہے، خلیفہ مامون الرشید کے دربار میں بڑے بڑے فقہاء، عالم اور ماہرین جمع ہوکر مختلف مسائل پر بحث کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایسی ہی ایک بحث چل رہی تھی کہ ایک نہایت ہی وجیہ خوبصورت شخص محفل میں شامل ہوا اور اس نے نہایت فصیح و بلیغ زبان اور عالمانہ انداز میں بحث میں حصہ لیا۔ اختتامِ مجلس پر خلیفہ مامون الرشید نے کہا کہ تم اسرائیلی ہو؟ اس نے کہا: جی ہاں! خلیفہ مامون نے کہا: تم مسلمان ہو جاؤ تو ہم تمہاری بہت قدر ومنزلت کریں گے، اس شخص نے کہا کہ میں اپنے آباء واجداد کا مذہب چھوڑنے کے لیے تیار نہیں اور چلا گیا۔ راوی کہتے ہیں کہ ایک سال بعد وہ مسلمان ہوکر مجلس میں شامل ہوا اور فقہی بحث میں بھرپور اور احسن انداز سے حصہ لیا۔ جب مجلس برخاست ہوئی تو مامون الرشید نے اس سے دریافت کیا کہ کیا تم وہی شخص نہیں جو گزشتہ سال بھی یہاں آئے تھے؟ اس نے کہا: جی ہاں! میں وہی شخص ہوں۔ خلیفہ نے پوچھا کہ تم نے اسلام کیسے قبول کرلیا؟ اس شخص نے جواب دیا کہ آپ کے پاس سے جانے کے بعد میں نے چاہا کہ میں مختلف مذاہب پر تحقیق کروں۔ آپ کو تو پتہ ہی ہے کہ میرا خط اچھا ہے، اس مقصد کے لیے میں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ میں نے نہایت عمدہ خط میں تورات کے تین نسخے لکھے اور اس میں کہیں کہیں کمی زیادتی کردی۔ وہ نسخے میں نے کنیسہ میں پیش کیے تو انہوں نے مجھ سے خرید لیے، پھر میں نے بڑی خوش خط کتابت کے ساتھ انجیل کے تین نسخے تیار کیے اور ان میں کمی زیادتی کردی، وہ میں نے عیسائیوں کے سامنے پیش کیے، تو انہوں نے بھی مجھ سے خرید لیے۔ پھر میں نے قرآن کو بھی بہت اچھے خط میں تحریر کیا اور حسبِ معمول تین نسخے تیار کرکے ان میں بھی تحریف کردی، پھر جب میں نے ان نسخوں کو مسلمان کتب فروشوں کی خدمت میں پیش کیا تو انہوں نے ان کی تحقیق کی، جب انہیں معلوم ہوا کہ ان نسخوں میں کمی زیادتی ہوئی ہے تو انہوں نے لینے سے انکار کردیا۔ پھر یہ شخص کہنے لگا کہ جب میں نے یہ صورت حال دیکھی تو مجھے اس بات پر یقین آ گیا کہ قرآن پاک ہی ایک واحد کتاب ہے جو ہر قسم کی تحریف سے پاک ہے اور یہی اس کی صداقت کی دلیل ہے۔ اس پر میں نے اسلام قبول کرلیا۔

یحییٰ بن اکثم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اسی سال میں حج کے لیے گیا تو سفیان بن عیینہؒ سے میری ملاقات ہوگئی، میں نے ان کو یہ واقعہ بیان کیا تو انہوں نے فرمایا کہ: یہی مطلب ہے: ''**بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ کِتَابِ اللّٰہِ**'' یعنی تورات کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ نے یہودیوں پر ڈالی تو انہوں نے اسے

ضائع کردیا اور قرآن مجید کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہے: ''إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ.'' (الحجر:۹)..... ترجمہ: ''ہم نے آپ پر اُتاری ہے یہ نصیحت اور ہم آپ اس کے نگہبان ہیں۔'' اس لیے قرآن مجید اب تک محفوظ ہے۔'' (تفسیر قرطبی، ج:۱۰، ص:۵-۶)

چونکہ قرآن کریم آخری کتاب ہے اور ہمیشہ کے لیے ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا ذمہ خود لیا اور ایسی حفاظت فرمائی کہ آج تک شرق وغرب میں اس کے لاکھوں حافظ موجود ہیں اور وہ تواتر کے ساتھ روئے زمین کے مسلمانوں کی زبانوں پر یکساں محفوظ ہے۔ ایک لفظ یا زبر زیر کا فرق نہیں۔ بفرضِ محال اگر قرآن کریم کے تمام مکتوبی اور مطبوعی نسخے روئے زمین سے معدوم ہوجائیں تب بھی قرآن کریم کا ایک جملہ اور ایک کلمہ بھی نہ ضائع ہوسکتا ہے اور نہ بدلا جاسکتا ہے۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ: دنیا کی کوئی کتاب ایسی محفوظ نہیں، جیسا کہ یہ قرآن کریم محفوظ ہے، سوائے قرآن کریم کے کوئی کتاب دنیا میں ایسی نہیں جس میں تغیر وتبدل اور تصحیف وتحریف واقع نہ ہوئی ہو۔ (تفسیر کبیر، ج:۵، ص:۲۶۵)

۵:-''بَلْ هُوَ اٰيٰتٌ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْعِلْمَ.'' (العنکبوت:۴۹)

''بلکہ یہ قرآن تو آیتیں ہیں صاف ان لوگوں کے سینوں میں جن کو ملی ہے سمجھ۔''

علماء کرام نے لکھا ہے کہ قرآن کریم کی حفاظت کے ذرائع صرف دو ہی ہوسکتے ہیں: ایک کتابت اور دوسرا اُسے حفظ کرنا، قربِ قیامت میں قرآن کریم کے الفاظ اُٹھا لیے جائیں گے، لیکن ''حفظِ قرآن'' کی صورت میں حفاظت کا ذریعہ باقی رہے گا اور یہ آخرت بلکہ جنت تک ساتھ جائے گا، اس پر کئی احادیث وارد ہیں۔

۶:-''وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْءَانَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ.'' (القمر:۱۷)

''اور ہم نے آسان کردیا قرآن سمجھنے کو، پھر ہے کوئی سوچنے والا؟۔''

اب چند وہ احادیث نقل کرتے ہیں جو بالکل صحیح سند اور متن کے اعتبار سے مضبوط ہیں:

۱:-''اَلْمَاهِرُ بِالْقُرْاٰنِ مَعَ السَّفَرَةِ الْكِرَامِ الْبَرَرَةِ، وَالَّذِيْ يَقْرَءُ الْقُرْاٰنَ وَ يَتَتَعْتَعُ فِيْهِ وَهُوَ عَلَيْهِ شَاقٌّ لَهٗ أَجْرَانِ.'' (رواہ البخاری، ج:۱، ص:۲۶۹)

''رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے قرآن کریم میں مہارت حاصل کرلی ہو، وہ معزز فرشتوں کے ساتھ ہوگا جو سفیر اور نیکوکار ہیں اور جو شخص قرآن کریم اٹکتا ہوا پڑھتا ہے، اور اس میں دقت اُٹھاتا ہے، اس کے لیے دو اجر ہیں۔''

ماہر وہی کہلاتا ہے جس کو یاد بھی خوب ہو اور پڑھتا بھی خوب ہو۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما رسولِ دو عالم ﷺ سے روایت کرتے ہیں:

۲:-''مَنْ قَرَأَ الْقُرْاٰنَ اسْتَدْرَجَ النُّبُوَّةَ بَيْنَ كَتِفَيْهِ إِلَّا أَنَّهٗ لَا يُوْحٰى إِلَيْهِ لَا يَنْبَغِيْ لِصَاحِبِ الْقُرْاٰنِ أَنْ يَّحِدَّ مَعَ مَنْ يَّحِدُّ وَلَا يَجْهَلَ مَعَ مَنْ يَجْهَلُ وَفِيْ جَوْفِهٖ كَلَامُ اللّٰهِ.'' (رواہ البیہقی فی شعب الایمان والحاکم فی المستدرک،قلت: قال الحاکم فی المستدرک علی شرط الشیخین، ج:۱،ص:۵۵۲)

ترجمہ:''جس آدمی نے قرآن کریم پڑھا، اس نے علومِ نبوت (قرآن) کو اپنی پسلیوں کے درمیان (دل میں) لے لیا، گو اس کی طرف وحی نہیں کی جاتی۔ صاحبِ قرآن کے لیے مناسب نہیں کہ وہ غصہ کرنے والے کے ساتھ غصہ کرے۔ اور نہ یہ مناسب ہے کہ وہ جہالت والے کے ساتھ جہالت سے پیش آئے، جبکہ اس کے پیٹ (دل) میں اللہ تعالیٰ کا کلام موجود ہے۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

۳:-''يَجِيْءُ الْقُرْاٰنُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيَقُوْلُ: يَا رَبِّ حَلِّهٖ فَيُلْبَسُ تَاجَ الْكَرَامَةِ، فَيَقُوْلُ: يَا رَبِّ زِدْهُ، فَيُلْبَسُ حُلَّةَ الْكَرَامَةِ، ثُمَّ يَقُوْلُ: يَا رَبِّ زِدْهُ، فَيُحَلّٰى حُلَّةَ الْكَرَامَةِ، ثُمَّ يَقُوْلُ: يَا رَبِّ ارْضَ عَنْهُ فَيَرْضٰى عَنْهُ، ثُمَّ يُقَالُ لَهٗ: اقْرَأْهُ وَارْقَهْ وَيُزَادُ بِكُلِّ اٰيَةٍ حَسَنَةً.'' (سنن الترمذی، ج:۲،ص:۱۱۹)

''قیامت کے روز قرآن مجید آئے گا اور سفارش کرے گا: اے رب! اس (حافظ) کو پہنائیے، پس (رب تعالیٰ اس کو) کرامت کا تاج پہنائیں گے، پھر کہے گا: اے رب! اس حافظ کے لیے اور زیادہ کر تو (اللہ تعالیٰ) اس کو کرامت کی پوشاک پہنائیں گے، پھر کہے گا: میرے رب! اس سے راضی بھی ہوجائیے، پس کہا جائے گا: پڑھتا جا اور (جنت میں) چڑھتا جا اور ہر آیت کے بدلہ ایک حسنہ (نیکی) کا اضافہ کیا جائے گا۔''

اب جنت میں قرآن کریم تو وہی پڑھ سکے گا جس نے حفظ اور یاد کیا ہوگا، جس نے قرآن کریم پڑھا ہی نہیں ہوگا، جس کو قرآن کریم کا تلفظ بھی صحیح نہیں آتا ہوگا وہ قرآن کریم کیسے پڑھ سکے گا؟

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

۴:-''اَلْقُرْاٰنُ أَفْضَلُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ فَمَنْ وَقَّرَ الْقُرْاٰنَ فَقَدْ وَقَّرَ اللّٰهَ وَمَنِ اسْتَخَفَّ بِالْقُرْاٰنِ اسْتَخَفَّ بِحَقِّ اللّٰهِ تَعَالٰى، حَمَلَةُ الْقُرْاٰنِ هُمُ الْمَحْفُوْفُوْنَ بِرَحْمَةِ اللّٰهِ الْمُعَظِّمُوْنَ كَلَامَ اللّٰهِ الْمُلْبَسُوْنَ نُوْرَ اللّٰهِ فَمَنْ وَالَاهُمْ فَقَدْ وَالَى اللّٰهَ وَمَنْ عَادَاهُمْ فَقَدِ اسْتَخَفَّ بِحَقِّ اللّٰهِ تَعَالٰى.'' (الجامع لاحکام القرآن للقرطبیؒ، ج:۱،ص:۲۶)

''قرآن ہر شئے سے افضل ہے، جس نے قرآن کی تعظیم کی اس نے اللہ تعالیٰ کی تعظیم کی اور جس نے قرآن کی بے قدری (اور توہین) کی اس نے اللہ تعالیٰ کے حق کی ناقدری

کی، حاملینِ قرآن (حفاظ اور علماء) اللہ تعالیٰ کی رحمت کے احاطہ میں ہیں، کلام اللہ کی عظمت اور قدر کرنے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے نور میں ملبوس ہیں، جنہوں نے ان سے دوستی رکھی انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دوستی رکھی، جنہوں نے ان سے دشمنی رکھی بے شک انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حق کی ناقدری کی۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

۵:-''إِنَّ الَّذِیْ لَیْسَ فِیْ جَوْفِهٖ شَیْءٌ مِّنَ الْقُرْآنِ کَالْبَیْتِ الْخَرِبِ.''
(مسند احمد، وجامع الترمذی وقال الترمذی حسن صحیح)

''وہ شخص جس (کے دل) میں قرآن مجید کا تھوڑا سا حصہ بھی نہیں وہ ویران گھر کی مانند ہے۔''

دل میں قرآن کریم تو اس شخص کے ہوگا جس نے اس کو حفظ اور یاد کیا ہوگا۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

۶:-''إِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَانَ یَجْمَعُ بَیْنَ الرَّجُلَیْنِ مِنْ قَتْلٰی أُحُدٍ فِیْ ثَوْبٍ وَّاحِدٍ، ثُمَّ یَقُوْلُ: أَیُّهُمَا أَکْثَرُ أَخْذًا لِلْقُرْآنِ، فَإِذَا أُشِیْرَ إِلٰی أَحَدِهِمَا قَدَّمَهٗ فِی اللَّحْدِ.'' (رواہ البخاری، فضائل القرآن الکریم وحملتہ فی السنۃ المطہرۃ لمحمد موسیٰ نصر، ص:۳۳)

''بے شک نبی ﷺ (جنگ) اُحد کے مقتولین میں سے دو دو آدمیوں کو (ایک قبر میں) دفن کرنے کے لیے جمع کرتے تھے، پھر فرماتے: ان میں سے قرآن کو زیادہ حاصل کرنے والا کون ہے؟ پس اگر ان میں سے کسی کی طرف اشارہ کیا جاتا تو اس کو لحد (قبر) میں پہلے رکھتے۔''

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ زیادہ سے زیادہ قرآن کریم حفظ کرنے کا جہاں دنیا میں (حفاظت قرآن، اشاعت قرآن، تلاوتِ قرآن) فائدہ ہے، وہاں آخرت میں بھی اس کا فائدہ اعزاز واکرام اور اجر وثواب کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

۷:-''إِنَّ عَدَدَ دَرَجِ الْجَنَّةِ بِعَدَدِ آیِ الْقُرْآنِ، فَمَنْ دَخَلَ الْجَنَّةَ مِمَّنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ فَلَیْسَ فَوْقَهٗ أَحَدٌ.'' (البیہقی فی شعب الایمان بسند حسن، الجامع الصغیر، ج:۲، ص:۴۵۸)

''بے شک جنت کے درجات قرآن کی آیات کی تعداد کے برابر ہیں، پس حفاظِ قرآن میں سے جو جنت میں داخل ہوگا اور پورا قرآن پڑھے گا اس سے اوپر کوئی نہیں ہوگا۔''

ان قرآنی آیات اور احادیث کا مطالعہ پوری طرح واضح کرتا ہے کہ قرآن مجید کے قیامت تک کے لیے مکمل ضابطۂ حیات ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کو آخری دن تک اصل صورت میں محفوظ رکھنے کا حکم فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے اصل متن کو انسانی تحریف سے محفوظ رکھنے کے لیے اس

کے تحفظ کی ذمہ داری خود لی ہے۔

....

اب صاحب مضمون کا شق وار جواب تحریر کیا جاتا ہے، صاحب مضمون لکھتے ہیں:

ا:-'' قرآن مجید کے حفظ کی رسم صدیوں سے مسلم سماج میں رائج ہے۔ عام تأثر یہ ہے کہ یہ قرآن مجید کی حفاظت کا ذریعہ اور باعثِ اجر وسعادت ہے۔ یہ تصور چند در چند غلط فہمیوں کا مرکب ہے۔''

محترم جناب! قرآن کریم حفظ کرنا رسم نہیں، بلکہ فرضِ کفایہ، حضور اکرم ﷺ کی سنت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طریقہ ہے، جو باعثِ اجر وثواب اور اس کی حفاظت کا ایک ذریعہ ہے اور مسلمانوں کے اس امتیاز اور خصوصیت کو محض تصور کہنا اور اس کو چند در چند غلط فہمیوں کا مرکب کہنا مضمون نگار کی اپچ ہے۔

۲:-'' قرآن مجید کا مقصد اس کے کلام اور پیام کا ابلاغ ہے۔ ابلاغ کے لیے کلام کا حفظ ہونا ضروری نہیں۔ قرآن مجید کے حفظ کرنے کی ہدایت، بلکہ ذکر تک قرآن مجید میں موجود نہیں۔''

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ جب قرآن کریم کا مقصد کلام اور پیام کا ابلاغ ہے تو جب کلام اور پیام محفوظ ہی نہیں ہوگا تو اس کا ابلاغ کیسے ہوگا؟ ورنہ تو یہ ابلاغ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تک محدود رہے گا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ کے بعد سے قیامت تک کے لوگوں کے لیے اس کلام اور پیام کا ابلاغ کیسے ہوگا؟ حضور اکرم ﷺ نے صرف کتابت پر اکتفا کیا تھا یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حفظ کرنے اور اپنے سینوں میں محفوظ کرنے کا حکم بھی دیا تھا؟ موصوف کا یہ کہنا کہ ابلاغ کے لیے کلام کا حفظ ہونا ضروری نہیں، یہ مضمون نگار کی اپنی رائے ہے جو کہ صحیح نہیں، کیونکہ جب کلام اور پیام کے الفاظ اور معنی ومطلب ہی پیغام دینے والے کو یاد اور معلوم نہیں تو ان کا ابلاغ کیسے ہوگا؟ جب کہ قرآن کریم میں تو ارشاد ہے:

''وَأَنْزَلْنَا إِلَيْکَ الذِّکْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَکَّرُوْنَ.'' (النحل:۴۴)

''اور اُتاری ہم نے تجھ پر یہ یادداشت کہ تو کھول دے لوگوں کے سامنے وہ چیز جو اُتری ان کے واسطے اور تا کہ وہ غور کریں۔''

قرآن کریم ذمہ داری لگا رہا ہے کہ پیغامبر اس کلام اور پیام کو بھی پہنچائے اور الفاظ، معنی ومطلب کو بھی بیان کرے۔ اور مضمون نگار نے خود بھی آگے کہہ دیا ہے کہ صرف الفاظ یاد نہ ہوں، بلکہ اس کا معنی بھی آتا ہو، گویا مضمون نگار مان رہا ہے کہ ابلاغ کے لیے صرف الفاظ ہی نہیں، بلکہ الفاظ اور معنی کا معلوم ہونا مبلغ کے لیے ضروری ہے، فہو المراد۔

۳:-قرآن مجید کی ایک آیت سے قرآن کے حفظ کا مفہوم اخذ کیا جاتا ہے: ''وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ.'' ہم نے اِس قرآن کو یاددہانی کے لیے نہایت موزوں بنادیا ہے۔ پھر کیا ہے کوئی یاددہانی

حاصل کرنے والا؟۔'' (القمر:۱۷) اس آیت سے قرآن مجید کا ایسا حفظ مراد لینا جس میں الفاظ ومعنی کے فہم سے کوئی تعلق نہ ہو سوءِ فہم ہے۔ ''ذکر'' کا لفظ ہی یہ بتانے کے لیے کافی ہے اس مفہوم کو یہاں لینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ''ذکر'' کے مفہوم میں تعلیم، تذکیر، آگاہی، تنبیہ، نصیحت، موعظت، حصولِ عبرت اور اتمامِ حجت جیسے تمام مفاہیم اس میں شامل ہیں۔''

جواب: اس کا جواب اپنی طرف سے لکھنے کی بجائے ساتویں صدی کے مفسرِ قرآن ابوعبداللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبیؒ سے لیتے ہیں کہ انہوں نے اس آیت کے بارہ میں کیا فرمایا ہے، تفسیر قرطبی میں ہے:

''أي سهلناه للحفظ وأعنا عليه من أراد حفظهٗ، فهل من طالب لحفظهٖ فيعان عليه؟ ويجوز أن يكون المعنى: ولقد هيأناه للذكر مِنْ يَسَّرَ نَاقَتَهٗ للسفر: إذا رحلها ويسَّر فرسهٗ للغزو إذا أسرجهٗ وألجمهٗ، قال:

وقمتُ إليه باللجام مُيسِّرا هنالك يجزيني الذي كنت أصنع

وقال سعيد بن جبير: ليس من كتب اللّٰه كتاب يقرأ كلهٗ ظاهرا إلا القرآن، وقال غيرهٗ: ولم يكن هٰذا لبني إسرائيل، ولم يكونوا يقرء ون التوراة إلا نظرا، غير موسٰى وهٰرون ويوشع ابن نون وعزير صلوات اللّٰه عليهم، ومن أجل ذٰلک افتتنوا بعزير لما كتب لهم التوراة عن ظهر قلبهٖ حين أحرقت على ماتقدم بيانهٗ في سورة براءة، فيسّر اللّٰه تعالٰى على هٰذه الأمة حفظ كتابهٖ ليذكروا مافيه.''

(تفسیر قرطبی، ج:۱۷، ص:۱۳۴)

''یعنی ہم نے قرآن کو حفظ کرنے کے لیے آسان کردیا ہے، جو حفظ کا ارادہ کرے ہم اس کا تعاون کریں گے، پس کوئی اس کے حفظ کا طالب ہے کہ اس کا تعاون کیا جائے؟ مشہور تابعی اور مفسرِ قرآن سعید بن جبیرؒ فرماتے ہیں کہ اللہ کی کتابوں میں قرآن کے علاوہ کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جسے حفظ سے تلاوت کیا گیا ہو۔ اور ایک مفسر کہتے ہیں: حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت ہارون علیہ السلام، حضرت یوشع بن نون علیہ السلام اور حضرت عزیز علیہ السلام تورات کے حافظ تھے، ان کے علاوہ بنی اسرائیل کے تمام لوگ اسے دیکھ کر پڑھتے تھے۔ اسی وجہ سے بنی اسرائیل تورات جل جانے کے بعد حضرت عزیز علیہ السلام کے محتاج ہوئے تھے تو انہوں نے ان کے لیے اپنی یاد سے تورات لکھ دی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس اُمت پر قرآن کے حفظ کرنے کو آسان کردیا، تاکہ قرآن اُن کے دل ودماغ میں محفوظ ہو اور ان کے اعضاء پر سلطنت کرے۔''

''قال الحسنؒ: أعطيت هٰذه الأمة الحفظَ وكان من قبلها لايقرء ون كتابهم إلا نظرا فإذا طبقوه لم يحفظوا مافيه إلا النبيون ..... وهم أصحاب محمد صلى اللّٰه عليه وسلم، والمؤمنون بهٖ يحفظونهٗ ويقرء ونهٗ، ووصفهم بالعلم.'' (تفسیر قرطبی، ج:۱۳، ص:۳۵۴)

’’حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس اُمت کو حفظ عطا کیا گیا ہے اور ان سے پہلے وہ اپنی کتابیں صرف دیکھ کر ہی پڑھا کرتے تھے، جب یاد کرنا چاہتے تو صرف انبیاء ہی حفظ کر سکتے تھے، اور یہ محمد ﷺ کے صحابہؓ اور ایمان والے ہیں جو اسے (قرآن مجید کو) یاد بھی کرتے ہیں اور پڑھتے بھی ہیں اور ان کو علم سے بھی متصف کیا ہے۔‘‘

۴: -’’ماہِ رمضان میں تراویح کی نماز، جو در حقیقت نمازِ تہجد ہی ہے، میں پورے قرآن مجید کی تلاوت اور اس کے سماع کا اہتمام مسلمانوں کا اپنا انتخاب ہے۔ اس کا سنت سے کوئی تعلق نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جبرائیل علیہ السلام کے ساتھ ماہِ رمضان میں قرآن مجید کا دور کیا کرتے تھے، نہ کہ نمازِ تہجد میں۔ نمازِ تہجد میں قرآن مجید کی تلاوت کا ذکر جہاں قرآن مجید میں آیا ہے تو دیکھا جا سکتا ہے کہ وہاں یہ سہولت دی گئی کہ جتنا ہو سکے اتنا پڑھ لیا جائے۔ ’’فَاقْرَءُوْا مَاتَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ‘‘ چنانچہ اب قرآن میں سے جتنا ممکن ہو، اِس نماز میں پڑھ لیا کرو۔‘‘ (المزمل:۷۳-۲۰)۔‘‘

جواب: موصوف کو رمضان المبارک میں تراویح میں مکمل قرآن کریم سنانے پر بھی اعتراض ہے، اور تراویح کو تراویح ماننے کے لیے بھی تیار نہیں، حالانکہ حضور اکرم ﷺ نے تین راتیں تراویح کی نماز پڑھائی۔ پہلی رات تہائی رات تک، دوسری رات آدھی رات تک، اور تیسری رات کو اتنی دیر تک پڑھائی کہ صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں: ہمیں اندیشہ ہونے لگا کہ کہیں سحری کا وقت نہ ختم ہو جائے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ڈھائی سالہ دور تقریباً جہاد میں گزرا، پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جب دیکھا کہ مسجدِ نبوی میں مختلف ٹولیوں میں صحابہؓ تراویح پڑھ رہے ہیں تو آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مشورہ اور اجماع سے ایک امام حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ -جن کو حضور ﷺ سب سے بڑے قاری ہونے کا تمغہ عطا فرما چکے تھے- کے پیچھے سب کو تراویح پڑھنے کا حکم دیا۔ وہ عشاء کی نماز کے بعد ایک امام کے پیچھے بیس رکعت نماز تراویح باجماعت اور پورے رمضان میں مکمل قرآن کریم کی تلاوت اور تراویح کے بعد وتر باجماعت پڑھاتے تھے۔ تب سے آج تک اہلِ سنت والجماعت اس پر عمل کرتے آرہے ہیں، کیونکہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

’’فعلیکم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدین المهدیینؓ، تمسّکوا بها وعضوا علیها بالنواجذ.‘‘ (مشکوٰۃ المصابیح، ص:۳۰، ط: قدیمی)

’’میری سنت اور خلفاء راشدینؓ کی سنت کو مضبوطی سے تھامو، اور کچلی کے دانتوں سے مضبوطی سے پکڑ کر رکھو۔‘‘

موصوف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل کو محض ’’مسلمانوں‘‘ کا انتخاب کہہ کر ایک تو یہ مغالطہ دینا چاہتے ہیں کہ یہ حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بہت بعد کے زمانہ کا عمل ہے اور ساتھ ہی اگر کوئی اعتراض کرے کہ کیا صحابہؓ مسلمانوں میں شامل نہیں؟! تو کہہ دیا جائے کہ میں نے صحابہؓ کا انکار تو

نہیں کیا۔ ہر عقل مند آدمی سوچ سکتا ہے کہ یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بے ادبی اور عام مسلمانوں کو مغالطہ دینے کی کوشش ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: ''نماز میں قرآن کریم پڑھنا سب سے افضل ہے۔'' اس کی وجہ یہ ہے کہ حضور ﷺ خود رات کا اکثر حصہ نماز اور قرآن کریم پڑھنے میں گزار دیتے تھے، جیسا کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک رات میں نے حضور ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے سورۂ بقرۃ، سورۂ آل عمران، سورۂ نساء اور سورۂ مائدہ تک تمام سورتیں ایک رات کی نماز میں تلاوت فرمائیں۔ موصوف ''فَاقْرَءُوْا مَاتَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ '' سے جو استدلال کررہے ہیں، یہ صحیح نہیں، کیونکہ حضور اکرم ﷺ نے اس آیت کی تفسیر اپنے عمل سے بتلادی، جیسا کہ اوپر گزرا ہے اور پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے تراویح میں اُسے پڑھ کر اُمت کے سامنے عملی نمونہ پیش کردیا۔

محترم حفظِ قرآن کے بھولنے پر وعیدات قرآن کریم اور احادیث میں موجود ہیں، جو تنبیہاً سنائی جاتی ہیں، تاکہ قرآن کریم سے کوئی حافظ، قاری اور عالم غافل نہ ہو، صحیح بخاری ومسلم میں یہ روایت موجود ہے کہ:

''تَعَاهَدُوْا الْقُرْآنَ فَوَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَهُوَ أَشَدُّ تَفَصِّيًا مِّنَ الْإِبِلِ فِيْ عَقْلِهَا -متفق عليه-'' (مشکوۃ:۱۹)

''قرآن کریم کی حفاظت کرو، قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، یہ قرآن اونٹ کے اپنی مہار سے نکلنے سے زیادہ تیز ہے۔''

اور بھولنے پر وعید حدیث میں ہے:

''قال: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم : بئس ما لأحدهم أن يقول: نسيت آيۃ كيت وكيت بل نُسِّيَ واستذكر القرآن فإنهٗ أشد تفصيًا من صدور الرجال من الفم -متفق عليه-۔'' (مشکوۃ:۱۹)

''رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: بہت برا ہے وہ شخص جو یہ کہے کہ میں فلاں فلاں آیت بھول گیا ہوں، ایسا نہیں بلکہ وہ بھلادیا گیا ہے، قرآن مجید کو یاد کرو، کیونکہ وہ منہ کی بنسبت لوگوں کے سینوں سے زیادہ جلدی نکلنے والا ہے۔''

ان احادیث سے جہاں یہ ثابت ہورہا ہے کہ قرآن کریم کا محفوظ رہنا بار بار دہرائی اور دور سے ہوتا ہے، وہاں یہ بھی ثابت ہورہا کہ بھلانے پر وعید بھی ہے، بلکہ فرمایا کہ: کوئی یہ نہ سمجھے کہ وہ بھول گیا، بلکہ بھلادیا گیا۔

موصوف کے نزدیک ''ان وعیدات کا مقصد قرآن مجید سے تعلق پیدا کرلینے کے بعد اگر وہ اسے بھول جائیں گے تو ان سے سخت مواخذہ ہوگا۔''

جواب: اول تو کوئی پوچھ سکتا ہے کہ اس تعلق سے کیا مراد ہے؟ اس کی درست تشریح کیا ہے؟ اور پھر یہ تعلق والی بات کس قرآن کریم کی آیت یا حدیث سے ثابت ہے؟ اور اردو محاورہ میں تعلق کا کیا معنی لیا جاتا ہے؟ اور نیز محض تعلق والی بات کہہ کر قرآن کریم کی عظمت اور حیثیت میں کیا کمی نہیں کی جارہی؟

۵:- ''رسول اللہ ﷺ سے منقول قرآن مجید کے حفظ کرنے کی ترغیب دلانے والی روایات میں سے جو معیارِ صحت پر پورا اُترتی ہیں ان میں بھی اس تصور کا پایا جانا ممکن نہیں کہ آپ نے لوگوں کو بلا سمجھے قرآن مجید کو زبانی یاد کرنے کی تلقین فرمائی ہو۔ آپ کے مخاطبین قرآن مجید کی زبان سے واقف تھے، ان کے لیے اسے سمجھے بغیر یاد کرلینا متصور ہی نہیں۔ البتہ عرب کی غالب اکثریت لکھنا پڑھنا نہیں جانتی تھی، لکھنے پڑھنے کا سامان بھی کم یاب تھا، قرآن مجید ان سب کو لکھ کر دے بھی دیا جاتا تو وہ اسے پڑھ نہیں سکتے تھے، قرآن مجید کی تعلیم کے ساتھ اسے حفظ کرلینے کی یہ ہدایات انھیں اس بنا پر دی گئیں کہ ان کے لیے قرآن مجید سے مراجعت کا یہی طریقہ رہ جاتا تھا کہ وہ اسے زبانی یاد بھی کرلیں۔ یوں اُس وقت قرآن مجید کے حفظ کے ذریعے سے بھی اس کی حفاظت کا کام لیا گیا، لیکن اس کی وجہ حالات کی یہ مجبوری تھی۔ چنانچہ عرب کے لوگ اپنی عادت کے مطابق قرآن مجید کو یاد کرلیتے تھے، جیسے وہ خطباء اور شعراء کے کلام کو زبانی یاد کرلیتے تھے۔''

جواب: گویا مضمون نگار نے مان لیا کہ حفظِ قرآن کی ترغیب دلانے والی روایات (احادیث) موجود ہیں اور صحابہ کرامؓ حفظ بھی کرتے تھے، اگرچہ ان کو حالات کی مجبوری بتایا، جب کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تو قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کا کلام اور اپنے ایمان میں اضافے کا ذریعہ سمجھتے ہوئے خوش ہوکر اس کی تلاوت اور حفظ کیا کرتے تھے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

''وَإِذَا مَا أُنزِلَتْ سُورَةٌ فَمِنْهُم مَّن يَقُولُ أَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهِ إِيمَانًا فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَزَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَهُمْ يَسْتَبْشِرُونَ.'' (التوبۃ:۱۲۴)

''اور جب نازل ہوتی ہے کوئی سورت تو بعضے ان میں کہتے ہیں: کس کا تم میں سے زیادہ کردیا اس سورت نے ایمان؟ سو جو لوگ ایمان رکھتے ہیں ان کا زیادہ کردیا اس سورت نے ایمان اور وہ خوش وقت ہوتے ہیں۔''

باقی چونکہ حفظِ قرآن تعلیم اسلام کے مراحل میں سے ایک مرحلہ ہے، حفظ کے بعد پھر یہ جان پہچان کہ یہ قرآن کریم کا کلمہ، اسم ہے یا فعل ہے یا حرف ہے، یا پھر ان کی ترکیب کیا ہے؟ پھر اس ترکیب کے ساتھ معنی کیا بنتا ہے؟ پھر عربی الفاظ کی لغات کیا ہیں؟ پھر حضور ﷺ، صحابہ کرامؓ اور ان کے بعد جمہور امت نے اس کا کیا مطلب لیا ہے؟ یہ تمام مراحل قرآن وسنت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہیں تو

حفظ کے بعد ان کا مرحلہ آتا ہے اور الحمد للہ! اکثریت حفاظ کی یہ مراحل بھی عبور کر لیتی ہے۔ آج تک کسی نے یہ نہیں کہا کہ صرف حفظ کر کے رک جاؤ، بلکہ علمائے کرام تو ترغیب دیتے ہیں کہ حافظ بننے کے ساتھ ساتھ عالم بھی بنو، اگلے مراحل بھی طے کرو۔ ہاں! بعض لوگ حفظ کے بعد معروضی حالات کی بنا پر یا تو یہیں تک رک جاتے ہیں یا دوسری دنیوی راہ اختیار کر لیتے ہیں تو اتنا تو ان میں بھی فضیلت اور شرف موجود ہے کہ وہ قرآن کریم کے الفاظ کے حاملین ہیں، پھر اللہ تعالیٰ آگے ان سے بھی کم از کم اتنا تو کام لے لیتا ہے کہ وہ اس کلام اور پیام کے الفاظ کا ابلاغ اگلی نسلوں تک کر لیتے ہیں۔ تو کیا موصوف ان حفاظ کو اس شرف اور فضیلت سے بھی محروم رکھنا چاہتے ہیں؟!

۶:-''یہ خیال ایجاد کیا گیا کہ قرآن مجید کا حفظ کرنا معجزہ ہے۔ یہ حقیقتاً درست نہیں۔ قرآن مجید صبح سے لے کر شام تک کا سارا وقت لگا کر اوسطاً تین سے چار سال میں حفظ کیا جاتا ہے۔ اتنا وقت اتنی ضخامت کی کسی بھی کتاب کو زبانی یاد کرنے کے لیے کافی ہے۔''

جواب: مضمون نگار قرآن کریم کے حفظ کو اللہ تعالیٰ کی عنایت اور قرآن کریم کا اعجاز ماننے کے لیے بھی تیار نہیں، یہ ایک ایسی بدیہی بات کا انکار ہے، جس کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ جس طرح ایک آدمی دن دہاڑے سورج کا انکار کرے تو اس کا کوئی علاج نہیں۔ اسی طرح اس بات کے انکار کا بھی کوئی علاج نہیں۔ تاریخ میں موجود ہے کہ امام محمدؒ- جو امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد ہیں- نے ایک ہفتہ میں مکمل قرآن کریم حفظ کر لیا۔ اس کے علاوہ تاریخ میں اور کتنی مثالیں موجود ہیں۔ ہمارے سامنے ایک ایسی مثال بھی موجود ہے کہ گزشتہ سال اقرأ روضۃ الاطفال ٹرسٹ لاہور کی تقریب میں ایک پونے چار سال کی بچی کو اسٹیج پر لایا گیا جس نے آٹھ ماہ میں پورا قرآن حفظ کر لیا اور اس نے مختلف جگہوں سے تلاوت کر کے قرآن کریم سنایا۔ یہ قرآن کریم کا اعجاز نہیں تو اور کیا ہے؟ صاحبِ مضمون سے یہ مطالبہ کیا جا سکتا ہے کہ قرآن کریم کے علاوہ اور کسی کتاب کے صرف ایک حافظ کو دکھلا دیں، جس نے قرآن کریم جتنا بڑی کتاب کو اتنے مختصر عرصہ میں حفظ کر لیا ہو: ''هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ.''

۷:-''ایک متھ یہ بھی ایجاد کی گئی ہے کہ حافظ قرآن کا ذہن زیادہ تیز ہوتا ہے۔ اس میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ کچھ بچے تو قدرتی طور پر زیادہ ذہین ہوتے ہیں اور اسی بنا پر ان کے والدین انھیں حفظ میں ڈال دیتے ہیں۔ یہ بچے دیگر میدانوں میں بھی ذہانت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ تاہم عام حافظ کا ذہن رٹا لگانے میں ماہر ہو جاتا ہے۔ فہم کلام کی مشق اس نے بچپن کے اس دور میں نہیں کی ہوتی جب یہ صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں۔ پاکستان میں چونکہ تعلیمی نظام عمومی طور پر رٹا پر مبنی ہے، اس لیے حفاظ یہاں بھی اچھی کارکردگی دکھا پاتے ہیں، مگر یہ حقیقت میں کوئی خوبی نہیں۔''

جواب: موصوف کی یہ تمام باتیں خود تراشیدہ اور حقائق سے بہت دور ہیں، قرآن کریم

پڑھنے ہی کی برکت سے ذہن تیز اور قوی ہوتا ہے۔ پڑھی ہوئی یا سنی ہوئی باتوں کو یاد کر لینے کا ملکہ قوی اور تیز ہو جاتا ہے، اس بنا پر وہ دوسرے میدانوں میں بھی بہت اچھی کارکردگی دکھاتا ہے، یہ ایسے حقائق ہیں جن کا زمانہ شاہد ہے۔ موصوف نے تو پورے پاکستان کے تعلیمی نظام پر بھی الزام لگا دیا کہ یہاں تعلیم رٹے پر مبنی ہے، جس کا جواب محکمہ تعلیم کے ذمہ ہے۔ راقم الحروف سمجھتا ہے کہ محض اپنی بات بنانے اور پاکستان کے پورے تعلیمی نظام کو موردِ الزام ٹھہرانا یہ بہت بڑی جسارت، زیادتی اور بہت بڑا الزام ہے، جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

> ۸:-''موجودہ دور میں جب کہ قرآن مجید کو محفوظ رکھنے، پڑھنے اور آیات اور موضوعات تلاش کرنے کے جدید ترین ذرائع وجود میں آچکے ہیں تو کوئی وجہ نہیں انسان کے قیمتی وقت کو ایک ایسی مشقت میں لگایا جائے جس کا کوئی مطالبہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا اور نہ دین کا کوئی مفاد اب اس سے وابستہ ہے۔''

جواب: موصوف سے کوئی پوچھ سکتا ہے کہ آپ اپنی ذات کے متعلق ان آلات اور ذرائع پر کیا کلی اعتماد کر سکتے ہیں؟ اگر نہیں کر سکتے تو آپ قرآن کریم جیسی کتاب کو ان ذرائع کا تختۂ مشق بنانے پر کیوں مصر اور تلے ہوئے ہیں اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ کفار؛ قرآن کریم کو مٹانے کے کیا کیا حربے کر چکے ہیں، آج بھی کر رہے ہیں اور آگے چل کر بھی کریں گے۔ کہیں موصوف کی یہ تجویز ان کے کام کو آسان کرنے کی معاون اور ممد تو نہیں؟ قرآن کریم کو حفظ کرنا محض مشقت نہیں، بلکہ سعادت، فضیلت اور اعزاز ہے، جس کا مطالبہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے اور مذکورہ بالا آیات اور احادیث اس پر کافی شاہد اور دلیل ہیں۔

آخر میں بطور ہمدردی اور خیرخواہی کے عرض کرنا چاہوں گا کہ موصوف اس تحریر سے دین اسلام، قرآن کریم اور مسلمانوں کی تو کوئی خدمت کر نہیں رہے، بلکہ قرآن کریم کی حفاظت، اس کی عظمت، اس کے تقدس واحترام اور مسلمانوں کے قرآنی نظام کو ختم کرنے کے درپے ہیں اور ان کی اس سوچ، فکر اور تدبیر سے کفار کا مقصد، منشأ اور ان کی خواہش پورا کرنے کی ایک بھونڈی کوشش ہے، اس کے علاوہ اس تحریر کا کوئی فائدہ نہیں۔

ہم موصوف سے پوچھنا چاہیں گے: کیا آپ اپنی اس تحریر کو آخرت میں اللہ تعالیٰ کے دربار میں لے کر پیش ہو سکتے ہیں؟ اور اس کا جواب دے سکتے ہیں؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر ایسے لاحاصل کام کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ **إن أريد إلا الإصلاح مااستطعت وماتوفيقي إلا بالله.**

وصلى الله تعالىٰ على خير خلقه سيدنا محمد وعلى آله وصحبه أجمعين

..... ۞ ..... ۞ ..... ۞ .....

حکومت کے اوصاف اور سربراہ کے فرائض

محدث العصر حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ

بلا شبہ حکومت اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے، بشرطیکہ حکومت صالح ہو، اور صالح حکومت وہی ہے جو اپنی رعایا کی جان ومال اور عزت وآبرو کی محافظ اور ان کی ضروریاتِ زندگی کی کفیل ہو، جس کے زیرِ سایہ رعیت کا ہر شخص سکون واطمینان کی زندگی بسر کرتا ہو۔ حکمران کے دل میں رعیت سے ہمدردی ومحبت ہو، ملکی ضروریات میں وہ عقل وتدبر اور عاقبت اندیشی سے کام لیتا ہو، قوم وملک کی راحت رسانی کے لیے مضطرب اور بے چین ہو۔ تاجر، زمیندار، مزدور اپنی اپنی جگہ مطمئن ہوں، تجارت وزراعت پیشہ افراد پر ٹیکسوں کا بوجھ اتنا ہو کہ وہ برداشت کرسکیں۔ مظلوم کو ظالم سے نجات حاصل ہو۔ مملکت میں بداخلاقی وبے حیائی کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے مؤثر تدابیر ہوں۔ فساد پیشہ افراد کی کڑی نگرانی ہو، حکام فرضِ منصبی ادا کرتے ہوں اور ان کی کوتاہی پر شدید باز پرس ہو۔ رشوت سے ملک پاک ہو، انصاف وعدل حکومت کے ہر شعبے میں جلوہ گر ہو۔ داخلی نظم ونسق وحفاظت کا نظام بے نظیر ہو، خارجی خطرات اور سرحدوں کی حفاظت کے لیے فوجی نظام قابلِ تعریف ہو۔ حکمران رحم دل ہو، بہادر ہو، مدبر وسیاست دان ہو، قابلِ قدر سیاست سے قوم کی کشتی کو منزلِ مقصود پر پہنچانے کی صلاحیت رکھتا ہو، تباہی وبربادی کی موجوں سے اپنے سفینے کو ساحلِ کامرانی پر صحیح وسلامت پہنچانے کی اہلیت رکھتا ہو۔ ایسی بداخلاقیوں میں مبتلا نہ ہو جن کی وجہ سے رعیت اور قوم کے دلوں میں اس کا وقار نہ رہے، کوئی ایسی حرکت نہ کرے جس سے اس کی عزت قلوب سے نکل جائے۔ الغرض شائستہ سیرت ہو، ملک کا خیرخواہ ہو، مملکت کو ہر طرح بامِ عروج تک پہنچانے کی اہلیت رکھتا ہو، خوش کردار وخوش گفتار ہو، مملکت کو ہر خطرے سے محفوظ رکھنے کا ذمہ دار ہو، عاقل، مدبر اور دور اندیش ہو، بردبار وحلیم ہو، طیش وغضب میں آنے والا نہ ہو۔ بلاشبہ ایسی حکومت رحمت ہے اور اگر حسنِ اتفاق سے کسی اسلامی مملکت کا مسلمان

سربراہ ہو تو ان باتوں کے علاوہ اس کا اہم ترین فرض یہ ہے کہ مسلمان قوم کی قیادت قرآن وسنت اور اسلامی قانون کے مطابق کرے۔

معاشرہ سودی کاروبار سے پاک ہو، زنا وشراب پر پابندی ہو۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے لیے محاکم احتساب قائم ہوں، محاکم عدلیہ میں حق تعالیٰ کا قانونِ رحمت جاری ہو۔ شریعتِ اسلامی کے مطابق فیصلے ہوتے ہوں، چوروں، ڈاکوؤں، شراب خوروں اور زناکاروں پر شرعی حدود قائم ہوں۔ ایسا اسلامی نظام وجود میں آئے کہ دنیا کے بعد آخرت کی زندگی میں ہر مسلمان اللہ تعالیٰ کی جنت اور نعمتوں کا مستحق ہو جائے۔ گویا دنیا کے نظام کو درست کرنے میں کافر ومسلمان دونوں برابر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ البتہ اُخروی نظام کے لیے مسلمان سربراہ کے فرائض زیادہ ہو جاتے ہیں۔ عملی فتنوں سے مملکت کو بچانے کی تدبیر میں کوئی تقصیر نہ ہو۔ اسی طرح علمی فتنوں سے دینِ اسلام کی حفاظت کی مؤثر تدبیریں اختیار کرے۔ تعلیم کی بنیاد دین پر ہو اور اسلام کی حفاظت کے ساتھ جدید علوم جو نافع سے نافع تر ہوں، ان کی تعلیم کا انتظام ہو۔ غرض یہ کہ مسلمان حکمران کا فرضِ منصبی جس طرح دنیا کو درست کرنا ہے، ٹھیک اسی طرح آخرت کی زندگی درست کرنے کی تدبیریں بھی اس کے ذمے ہیں۔ یہ وہ نظام ہے جس کو اسلام نے ’’السلطان ظل اللّٰه في الأرض من أكرمهٗ أكرمه اللّٰه ومن أهانهٗ أهانه اللّٰه.‘‘ (شعب الایمان للبیہقی) کے منصبِ عالی پر پہنچا دیا، اور جس کو آسمانی وحی نے ’’أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ‘‘ (النساء:۵۹) کے بعد ’’وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ‘‘ فرما کر اعلیٰ ترین منصب عطا فرما دیا۔ اس وقت علمی انداز سے علماء نفسیات یا علماء اخلاق نے جو کچھ لکھا ہے، اس کی تفصیل مقصود نہیں۔ حکماء وفلاسفہ نے جو کچھ لکھا ہے، یا ابن خلدونؒ، جلال الدین دوانیؒ اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے جو کچھ لکھا ہے ان باتوں کو لکھنا منظور نہیں:

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

یہاں تو اقتدار کی ہوس ہے، جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا قصہ ہے، نہ صفاتِ عالیہ کی بحث ہے، نہ کمالات کا ذکر ہے۔ اس ملک کی تاریخ اور دورِ حاضر کے دیگر ملکوں کی تاریخ خواہ اسلامی حکومتیں ہوں یا غیر اسلامی ہوں، ایشیائی مملکتیں ہوں یا یورپی، دیکھ کر عبرت ہی عبرت ہوتی ہے۔ دنیا میں کتنا بڑا زوال آ گیا، ہر حکمران مسولینی، ہٹلر اور چرچل کی تاریخ دہرانا چاہتا ہے اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کو اپنی اعلیٰ ترین کامیابی سمجھتا ہے۔ یہاں حیا، رحم دلی، انصاف، خوفِ خدا، خوفِ خلقِ خدا کا کیا سوال؟ حدیثِ نبوی میں ’’امامِ عادل‘‘ عادل حکمران کا مرتبہ ان سات اشخاص میں ذکر فرمایا ہے جو قیامت کے روز عرش کے سایہ میں ہوں گے:

’’عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ’’سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمْ

اللّٰهُ فِيْ ظِلِّهٖ يَوْمَ لَاظِلَّ إِلَّا ظِلُّهٗ اَلْإِمَامُ الْعَادِلُ ''(صحیح البخاری، کتاب الاذان، باب من جلس فی المسجد ینتظر الصلوۃ وفضل المساجد، ج:۱،ص:۹۱، ایضاً کتاب الزکوۃ، باب الصدقۃ بالیمین، ج:۱،ص:۱۹۱، ط: قدیمی)

موجودہ دور کے حکمرانوں کی حالت دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ اپنی مخلوق سے ناراض ہوگیا ہے، ان پر بے رحم ظالموں کو مسلط کردیا ہے جن کے سامنے ہوسِ اقتدار کے سوا کوئی اور مسئلہ نہیں۔ حق تعالیٰ نے اس دنیا کے مناصب کو اتنا ذلیل کردیا ہے کہ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کا مصرع صادق آتا ہے:

طوقِ زریں ہمہ در گردن خری بینم

دور جانے کی حاجت نہیں، اپنے بدنصیب ملک کی تاریخ پر ایک نظر ڈالو، یکے بعد دیگرے یہاں کیسے کیسے افراد آئے؟ دیکھئے! اور اپنی قسمت کو رویئے! اللہ تعالیٰ نے عرصہ دراز کی غلامی کے بعد ایک پاکیزہ خطہ عطا فرمایا تھا، تاکہ ہم اپنے وعدوں کو سچ کر دکھاسکیں، لیکن جو کچھ ہوا اور جو کچھ ہورہا ہے آپ کے سامنے ہے۔ بجز حسرت وافسوس اور آہ وبکا اور کیا کرسکتے ہیں؟ اے اللہ! اپنی مخلوق پر رحم فرما، ہمارے اس بگڑے نظام کو تو ہی درست فرماسکتا ہے۔ ہمارے ان حکمرانوں کو عدل وانصاف کے تقاضوں کے مطابق حکومت چلانے کی صحیح اہلیت عطا فرما، تاکہ صحیح معنوں میں یہ حکومت سایۂ رحمت ہو، دین ودنیا کی برکات سے مالامال ہو۔ رعیت وقوم مطمئن اور آسودہ حال ہو، ظاہری وباطنی ترقیات نصیب فرما۔ اعداء اسلام اور کافروں کی ریشہ دوانیوں سے اس مملکت کی حفاظت فرما۔ راعی ورعیت دونوں کو اپنی ربوبیت کریمانہ عادلانہ کا مظہر بنا۔ ایسا نظام مبارک عطا فرما جس کے ذریعہ آخرت وجنت کی نعمتوں کے ہم مستحق بنیں۔ اے اللہ! آپ ہر چیز پر قادر ہیں، ہم عاجز ہیں، تو قادر ہے۔

وصلى الله على سيد البرية خاتم النبيين محمد وعلى آله وصحبه أجمعين

اعلان

قارئینِ بینات کو مطلع کیا جاتا ہے کہ محرم ۱۴۴۱ھ سے ماہنامہ بینات کا زرِسالانہ مبلغ ۴۵۰ (چارسو پچاس) روپے ہوگا۔ ماہنامہ بینات کے پرانے اور نئے خریدار آئندہ سال کے لیے اسی حساب سے رقم بھجوائیں۔ **(ادارہ بینات)**

سلسلۂ مکاتیب حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ

انتخاب وترتیب: مولانا سید سلیمان یوسف بنوری

مکتوب مولانا محمد بدرِعالم میرٹھیؒ بنام حضرت بنوریؒ

محترم بندہ جناب مولانا یوسف صاحب دام فضلہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ موصول ہوا، مشکور فرمایا، خداتعالیٰ آپ کے کلمات مبارک فرمائے، جو شروح آپ نے لکھیں کس کی ہمت، پھر کس کو فرصت ہے کہ ان کا مطالعہ کرسکے۔ ''کرمانی'' کی شرح گو طبع ہوگئی ہے، مگر محدث' حافظ جیسے نہیں ہیں۔ حافظ کی کتاب سے اس کا اندازہ ہوسکتا ہے، جو گرفتیں انہوں نے فرمائی ہیں ان سے اس کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔ عارف ابن ابی جمرۃ کی کتاب سطحی دیکھی، زیادہ حصہ لطائف پر مشتمل ہے، دعا کیجیے کہ ''فتح''، ''عمدہ'' جستہ جستہ اگر نظر سے گزر جائے بڑا مالِ غنیمت ہاتھ لگ جائے، فوائد سے کبار کے کلمات کب خالی ہوسکتے ہیں، مگر مشہور ہے: ''**طلب الکل فوت الکل**''، یہ حقیر ہمیشہ سے کم ہمت رہا اور اب تو کچھ صحت، کچھ حوادثِ عمر اور عدمِ مساعدتِ زمان نے بقیہ ہمت بھی شکست کردی ہے، ہماری ساری عمر کی محنت کل یہ قیمت رکھتی ہے کہ جب چاہے جی چاہے اور جس کا جی چاہے چند دراہم معدودہ یا مغشوشہ کے عوض دے کر خرید لے، اور پھر اس پونجی کو جب چاہے ذرا سی بات پر مٹی میں ملادے۔

...کے تجربہ نے میرے خیالات پر بہت اثر کیا ہے اور اس کے بعد پھر میرا ملازمتِ مدرسہ کرنا تعجبات سے خالی نہیں ہے۔ مئو کی زیادہ روشن ملازمت کا ترک کرنا اور پنجاب کی ملازمت کا اس سے کم پر اختیار کرنا کچھ ایسے ہی تأثرات کے تحت ہے، یہاں بھی صرف ایک سال کے لیے تصریح کرکے ملازمت قبول کی ہے، اگر کچھ بیّن فائدہ نظر آیا تو خیر! ورنہ شبعِ بطن درکار ہے، وہ گھر کے قرب میں بھی ناپید نہیں۔

عمر تھوڑی ہے، حسرت وارمان نکل چکے ہیں، ماحول کے تجربات نے جذبات ختم کردیے

ہیں، اور آخر مجبور ہوکر تقدیر پر راضی ہونے کے لیے دل تیار ہے۔ خدا آپ کا حامی ہو اور آپ کے علمی فوائد سے مستفیض کرے، آپ کو اُمت کے لیے نافع بنائے اور افادہ واستفادہ کی بیش از بیش ہمت دے:

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیماں کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنہیں چاہ کے ارماں ہوں گے

یہاں بحمد اللہ! مدرسہ میں جسمانی ہر قسم کا آرام میسر ہے، اور اگر اصحابِ اقتدار وریاست کا اعزاز' علماء کے لیے کچھ باعثِ مسرت ہو تو اس سے بھی اللہ تعالیٰ نے محروم نہیں فرمایا۔ دعا کیجیے کہ طلبہ، اہلِ علم جمع ہوں اور اس ریگستان میں کوئی علمی فضا پیدا ہو جائے۔

ڈابھیل سے میرا آنا اور پھر یہاں آکر متفرق حالات میں صبح وشام ادھر اُدھر بسر کرنا، پھر اس نوع کے مشاغل سے علیحدگی ایسے اسباب تھے کہ بہت سے ضروری امور فراموش ہوتے رہے۔ مجھے یقین ہے کہ جو مضمون آپ کے پاس نہیں رہا کسی اور صاحب کے پاس رہا، گاہ گاہ خیریت سے مطلع فرماتے رہیں، اور بدرِعلم اور صرف بدرِعلم آپ کی قدر، بلکہ یاد بھی دل میں رہتی ہے۔ عزیزہ عائشہ اور اس کے نوزائیدہ بھائی (۱) کو بہت بہت پیار۔ فقط

بندہ حقیر محمد بدرِ عالم عفی اللہ عنہ
مدرسہ جامع العلوم بہاولنگر
۹ ذیقعدہ ۶۳ھ/ ۱۲۶/ اکتوبر ۴۴ء جمعہ

مکتوب مولانا محمد بدرِعالم میرٹھیؒ بنام حضرت بنوریؒ

بندہ حقیر محمد بدرِ عالم عفا عنہ
۲۳ فروری ۴۸ء
مکرم ومحترم جناب مولانا محمد یوسف صاحب دام مجدہم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مکتوب گرامی موصول ہوا اور اس سے قبل ایک ملفوف موصول ہوا تھا، آپ کے خط سے تیار شدہ ملبوسات پہنچ جانے کا علم ہوا.... صاحب کو میرا پتہ نہ لگ سکا، اس لیے آپ کا مکتوب ملنے پر احقر خود ان کا پتہ لگانے کے لیے نکلا، جو بندہ بابندہ ان کا پتہ لگ گیا، کپڑے موصول ہو گئے، علی شرط الشیخین تھے،

حاشیہ: (۱) حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے پہلے صاحبزادے محمد الیاس کا تذکرہ ہے، جو ڈابھیل میں پیدا ہوئے اور اسی دور میں لگ بھگ تین برس کی عمر میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔

میں تو ابن ماجہؒ کی شرط پر بھی راضی تھا، آپ نے یہ کرم کیا کہ اس قحط کے زمانہ میں بہتر سے بہتر کپڑے مہیا کردیئے، بڑی اعتنا فرمائی، بڑی زحمت گوارا کی، **جزاکم اللّٰہ تعالٰی خیر الجزاء.**

حاجی محمد صاحب نے اگر قیمت ادا کردی تو مضائقہ نہیں: ''**ما أوتیتَ من غیر إشراف نفس فخذہ**'' اللہ تعالیٰ میرے اور ان کے دونوں کے حق میں مبارک فرمائے۔ سب کپڑے جنس ونوع اور کم وکیف ہر اعتبار سے نہایت موزوں تھے، اور کمال یہ کہ میرے جسم کے بالکل برابر تھے۔

کتاب کا نام ''(**جامع العلوم والحکم فی شرح خمسین حدیثاً من)جوامع الکلم لابن رجب الحنبلیؒ**'' ہے، یہ کتاب نوادر میں سے نہیں، نہ غیر معروف ہے، البتہ لوگوں نے عام طور پر اس سے کم استفادہ کیا، احقر نے اس کتاب کو بغور دیکھا اور بہت سی معلومات ایسی ہاتھ آئیں جو دوسری بڑی شروح میں ہاتھ نہ لگ سکیں، معلوم نہیں کہ آپ کے مذاق کے مطابق ہوگی یا نہیں!

حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی منتشر تحقیقات جو ''**کتاب الإیمان** '' سے مفہوم نہیں ہوسکتیں، اس کتاب سے بخوبی حل ہوجاتی ہیں۔ درس میں عمرِ عزیز کا اکثر حصہ صرف کرنے کے بعد شروحِ حدیث میں میرا مذاقِ طبیعت بدل چکا ہے، حضرت شاہ صاحبؒ کے آخری عمر کے فقرے آپ کے دماغ میں گونج رہے ہوں گے، اب میں ان کلمات کو اپنی بساط کے مطابق ذوقاً محسوس کررہا ہوں، ''**ترجمان السنة** '' کی تالیف میں درسیات کے علاوہ غیر درسیات سے بھی آشنا ہونے کا اچھا موقع دے دیا، پچھلی دماغ سوزی نے بڑی راہنمائی کی، اور شیخ مرحوم کی نادر عادات نے ان کتابوں کے سمجھنے کا کچھ کچھ سلیقہ بتادیا، میرے ناقص خیال میں یہ کتاب نہایت نافع ہے، مجھے اپنی عمر میں بعض اشکالات جو ہنوز حل نہ ہوسکے، چونکہ اس کتاب سے مل گئے، اس لیے یہ کتاب میرے زخموں کا مرہم بن گئی۔ علمی خارستان میں سب کو یکساں زخم نہیں لگتے، ہر شخص کا درد مختلف ہوتا ہے اور ہر درد کی دوا بھی مختلف ہے، اگر آپ بھی میرے درد میں شریک ہیں تو اس کتاب کے مطالعہ سے جو کیف میں نے حاصل کیا ہے آپ بھی حاصل کریں گے، مختصر بات صرف ''**وَأَهُشُّ بِهَا عَلٰی غَنَمِيْ الخ**'' کے قبیل سے دراز ہوگئی۔

حرمین شریفین کا قیام، عالم کے عنوان سے نہیں چاہتا، حضرت مولانا شفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا فقرہ یاد ہے، فرماتے تھے کہ: ''چالیس (برس) یہاں گزر گئے، اور اکثر لوگ اب تک اس سے بھی ناواقف ہیں کہ میرا شمار زمرۂ علماء میں ہے یا نہیں!'' اور اب تو دورِ فتن ہے۔ تفصیلاً ان شاء اللہ تعالیٰ! پھر عرض کروں گا۔ مولوی مالک سلمہٗ سے سلام مسنون کہہ دیجیے کہ مدت سے ان کا خط نہیں ملا، میں نے اپنے علم کے مطابق ہر خط کا جواب دیا ہے، اگر کسی وجہ سے ان کو نہ ملا ہو تو خطوط اموالِ ربویہ میں سے نہیں ہیں جس میں ایک طرفہ زیادتی ناجائز ہو۔ حاجی محمد صاحب وحاجی ابراہیم میاں صاحب ومہتمم صاحب کو سلام مسنون۔ سب بچوں کو دعا وپیار۔ آپ کی آمد کا انتظار ہے، اس کے متعلق آپ نے کچھ نہ لکھا۔

اسلام اور سیکولرزم

مفتی عبدالرؤف غزنوی
(تیسری اور آخری قسط) سابق استاذ: دارالعلوم دیوبند انڈیا، حال استاذ: جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

تیسرا باب

ہندوستان کی مسلم اقلیّت کے لیے ایک مناسب لائحۂ عمل

سیکولرزم کی متعدد توجیہات کا قرآن وسنت کی روشنی میں جائزہ لینے اور اسلامی نقطۂ نظر سے ان کا حکم بیان کرنے کے بعد اب ہم اس سبب کو بھی بیان کرنا چاہتے ہیں جس کی بنا پر ہم ہندوستان میں ایک وقت مقررہ تک سیکولر حکومت کے قیام کی حمایت کرتے ہیں۔ ظاہر ہے بات فقط اتنی ہوتی جتنی ''راجیو بھارگوا'' نے پانچویں توجیہ میں بیان کی ہے تو ہم تمام مصلحتوں کو نظر انداز کر کے سیکولرزم کے تئیں مخالفانہ رویہ اپناتے، کیونکہ اس توجیہ کی رو سے وہ بھی تحریکِ الحاد کی ایک ذیلی تحریک قرار پاتا ہے، جب کہ ہمارے نزدیک حقیقت یہ نہیں جو ''راجیو بھارگوا'' نے اپنے مضمون کی آخری توجیہ میں بیان کی ہے، کیونکہ ہندوستان کا سیکولر دستور نہ صرف یہ کہ مذہبی معاملات میں مداخلت نہیں کرتا، بلکہ مندرجہ ذیل دفعہ کے ذریعہ ملک کے تمام مذاہب کو تبلیغ واشاعت کی پوری آزادی دیتا ہے:

> ''تمام اشخاص کو آزادیِ ضمیر اور آزادیِ مذہب قبول کرنے، اس کی پیروی کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کا مساوی حق ہے، بشرطیکہ امنِ عامہ، اخلاقِ عامہ، صحتِ عامہ اور اس حصہ کی دیگر توضیحات متأثر نہ ہوں۔'' (بھارت کا آئین: ۲۶)

ہندوستان چونکہ بہت سے مذاہب اور بے شمار قوموں سے عبارت ہے، اس لیے یہاں تمام قوموں کے جذبات واحساسات کا لحاظ رکھتے ہوئے حکومت ایسی غیر جانبدارانہ ہونی چاہیے جو کسی ایک مذہب کی وکالت کے بجائے تمام مذاہب کی اشاعت وحفاظت کی راہیں ہموار کرتی ہو، تو مختلف مذاہب

کو مساوی حق دینے اور ملک کے تمام باشندوں کو بلاتفریقِ مذہب وملت یکساں مواقع فراہم کرنے کا نام ہی ہندوستان میں سیکولرزم ہے، ''سی آر گوپال آچاریہ'' اور ''راجیو بھارگوا'' نے بھی تیسری توجیہ میں یہی معنی بیان کیے ہیں اور آزاد ہندوستان کی معمار شخصیتیں بھی سیکولرزم کی بابت ان ہی خیالات کا اظہار کرتی رہی ہیں۔

تو اس طرح قانونی رو سے جہاں ہمارا پرسنل لاء ایک حد تک محفوظ قرار دیا جاسکتا ہے، وہیں دستورِ ہند کے تحت ہمیں اس بات کا بھی پورا حق پہنچتا ہے کہ ہم اسلامی تعلیمات کی اشاعت، دینی عبادات وشعائر کا اہتمام اور قصرِ اسلامی کی تعمیر میں جی جان سے جُت جائیں، نیز دلیل وحجت کے ذریعہ اسلام کو تمام ادیان سے عظیم ثابت کردیں۔ لائحۂ عمل کے باب میں ہمیں ان ہی خطوط کو طے کرنا، ان ہی اُمور پر غور کرنا اور ان ہی نقطوں کو سمجھنا ہے جن پر ہماری ہی نہیں آئندہ آنے والی تمام نسلوں کی کامیابی وناکامی کا دارومدار ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کمزوریوں کی بھی نشاندہی کرنی ہے جنہوں نے عرصۂ دراز سے صلاحیتوں کو مفلوج کرکے ہماری ترقی کی راہیں مسدود کررکھی ہیں۔

مسلمانانِ ہند کی دو خامیاں اور ان کی اصلاح کی ضرورت

جہاں تک میں سمجھتا ہوں موجودہ دور میں ہماری سب سے مہلک بیماریاں دو ہی ہیں: ایک اتحاد کا فقدان اور دوسری تعلیم میں حد درجہ پسماندگی۔ یہی وہ کمزوریاں ہیں جو کسی بھی قوم کو اوجِ ثریا سے ہٹا کر تحت الثریٰ میں دھکیل دیتی ہے۔ ہم ہی نہیں دنیا کی تاریخ میں جو قومیں بھی تباہی وبربادی کے گڑھوں کی جانب تیز تیز قدموں سے بھاگتی نظر آتی ہیں، ان میں دیگر خرابیوں کے علاوہ یہ دونوں بیماریاں بھی بدرجہ اتم موجود ہیں، جنہوں نے نہ صرف یہ کہ انہیں قیادت سے محروم کردیا، بلکہ بحیثیت قوم ہمیشہ ہمیش کے لیے انہیں دنیا کے پردے سے ہٹا دیا۔ ماضی کی طرح آج بھی مسلمانوں کے اکثر وبیشتر مسائل ان ہی دو خرابیوں کی پیداوار ہیں اور انہیں نقصانات سے بچانے کے لیے قرآن کریم نے اتحاد ویک جہتی پر زور دے کر تفرقہ بازی کی سخت مذمت کی ہے:

''وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔'' (آل عمران:۱۰۳)

''اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑے رہو اور متفرق مت ہو۔''

اور وہ تمام مسلمانوں کو حقیقی بھائیوں کی طرح مل جل کر رہنے کی تلقین کرتا ہے:

''إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ إِخْوَۃٌ۔'' (الحجرات:۱۰)

''مسلمان تو آپس میں سب بھائی بھائی ہیں۔''

اہلِ اسلام کو باہم نرم اور غیروں کے بالمقابل گرم دیکھنا چاہتا ہے:

''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ۔'' (الفتح:۲۹)

''محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو صحابہؓ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں کے حق میں سخت ہیں اور آپس میں ایک دوسرے پر مہربان ہیں۔''

تفرقہ کے نقصانات کو اُجاگر کر کے جہاں اس کی راہوں کو مسدود کرتا ہے وہیں اُمت کو ایک نقطہ پر جمع ہونے اور اپنی صفوں میں کامل اتحاد کی تاکید کرتا ہے:

''وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ۔'' (الأنفال:۴۶)

''اور اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو، ورنہ تم کمزور ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی۔''

مسلمانوں کے عہدِ گزشتہ کی تاریخ بھی اس کی شہادت دیتی ہے کہ جہاں وہ قدم سے قدم ملا کر چلے، باہمی تعاون، میل و مروت اور اتحاد و یک جہتی کو اپنا شعار بنایا، وہیں کامیابی نے ان کے قدم چوم لیے اور نہ صرف یہ کہ وہ مشرق و مغرب میں پھیل گئے، بلکہ ایشیا، افریقہ اور یورپ کی تمام قومیں ان کا راستہ چھوڑ کر الگ کھڑی ہوگئیں۔ انسانی تاریخ کے تمام کھنڈرات آج بھی مسلمانوں کی اسی عظمتِ رفتہ کی گواہی دیتے ہیں۔ لیکن جہاں وہ اجتماعیت سے دستبردار ہوکر انفرادیت کا شکار ہوئے، اتحاد و یکجہتی کا دامن ان کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا اور تفرقہ کی ان کے درمیان آہنی دیواریں کھڑی ہوگئیں، وہیں ان کے وقار اور دبدبہ کو نہ صرف سخت دھچکا لگا، بلکہ اس نازک موقع سے فائدہ اُٹھا کر دشمن بھوکے شیر کی طرح ٹوٹ پڑے اور آن کی آن میں ان کی سلطنت و پادشاہی کو تہ و بالا کر ڈالا۔ ماضی میں اسپین اور دورِ حاضر کی تمام مسلم حکومتیں اس سلسلہ کی زندہ مثالیں ہیں۔ اس لیے آج کے ان خطرناک حالات میں ماضی کے تلخ تجربوں سے درسِ عبرت حاصل کرتے ہوئے ہمارے لیے یہ امر ناگزیر ہوگیا ہے کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے اختلافات کی خلیج کو پاٹ کر اپنی صفوں میں کامل اتحاد پیدا کریں، صبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے انفرادی خواہشات کو کچل دیں اور ملت کو ایک پلیٹ فارم پر لا کر اپنے حقوق کو حاصل کرنے کے لیے مل جل کر مجاہدہ کریں۔ نیز حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے ہمیں ان تمام آپسی عداوتوں، چپقلش اور فروعی اختلافات کو بھی مٹا دینا ہوگا جنھوں نے زمانۂ دراز سے مسلمانانِ ہند کے درمیان اجنبیت و غیریت کی بلند دیواریں کھڑی کر رکھی ہیں۔ یہ وقت کا اہم ترین تقاضا ہے جسے مسلمانوں کو ہر حال میں پورا کرنا ہے۔

دوسری ہلاکت خیز بیماری تعلیم میں حد درجہ پسماندگی ہے جو مسلمانوں کے اندر زہر کی طرح

سرایت کرچکی ہے، ان کی ایک بڑی اکثریت آج بھی دینی و دنیاوی علوم سے ایسے ہی ناآشنا ہے جیسے کہ شہری تہذیب وتمدن سے دورقبائلی خاندان ہوا کرتے ہیں، پھر ان کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی حالت بھی کچھ زیادہ قابلِ اطمینان نہیں، وہ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں عصری علوم سے تو ایک حدتک واقف ہوگیا، لیکن اسلام کے بنیادی عقائد توحید، رسالت وقیامت سے اتنا ہی ناواقف رہا جتنا کہ ایک غیرمسلم ہوسکتا ہے، جبکہ مسلمانوں کا وہ طبقہ جو حاملینِ شریعت اور دینی قیادت کا دعویدار ہے، وہ مدارسِ اسلامیہ میں بخاری، مسلم، جلالین، ہدایہ جیسی معرکۃ الآراء کتابوں میں تو مہارتِ تامہ حاصل کرچکا ہے، لیکن اس کے اکثر افرادعصری علوم وزبان سے اتنے ناآشنا ہیں کہ ریلوے اسٹیشن پر ریزرویشن کا فارم بھی اپنے ہاتھوں سے پُرنہیں کرسکتے، بلکہ حریفوں کےمحتاج ہوتے ہیں۔جس قوم نے افریقہ وایشیا میں علم وحکمت کے چراغ جلائے تھے، یورپ میں صنعت وحرفت کی قندیلیں روشن کی تھیں، جس نے ابن خلدون، رازی اورابن سینا جیسے عظیم مؤرخین، مفکرین اور سائنسدانوں کوجنم دیا تھا اور جو پوری دنیا کے علوم کی واحد امین تھی، آج علمی وفکری حیثیت سے اتنی کنگال ہوچکی ہے کہ اس کا شمار دنیا کی پسماندہ ترین اقوام میں کیا جارہا ہے۔

ملت کے ان دونوں حلقوں کی غفلت کومسلم اقلیّت کی موجودہ حالت کی روشنی میں دیکھتے ہوئے بےاختیار آنسونکل پڑتے ہیں کہ قائدینِ ملت نہ صرف یہ کہ وسعتِ نظری سے کنارہ کش رہے، بلکہ آج تک دورِ حاضر کے تقاضوں پرغور نہ فرماسکے، اس لیے اب وقت آچکا ہے کہ مسلمانانِ ہند طویل نینداور مدہوشی سے بیدار ہوں اور دونوں طبقے مل جل کر ایسا لائحۂ تعلیم مرتب کریں جس پرعمل پیرا ہوکر نہ صرف یہ کہ اپنے ماتھے سے تعلیمی پسماندگی کا داغ مٹادیں، بلکہ اس میدان میں دوڑتی تمام قوموں کو پیچھے چھوڑ دیں۔

دینی مدارس اوراسلامی اداروں کے ذمہ داروں کوموجودہ دور کے اندر ہندوستان کی مسلم اقلیت کے تقاضوں کو دیکھتے ہوئے اپنے اس قدیم طرزِعمل اورمروج نصابِ تعلیم پرنظرثانی کرکے وہ تمام خامیاں دورکرنی چاہئیں جس کی وجہ سے ہمارے علماءعصری علوم سے بالکل ناآشنا رہے ہیں۔ نیز مدارسِ اسلامیہ میں جہاں تفسیر وحدیث اور فقہ جیسے علوم کو پڑھایا جائے، وہیں اسلام کی روشنی میں عصری علوم، رائج الوقت زبانوں اور سائنس کی تعلیم دینا بھی وقت کی اہم ترین ضرورت ہے، اس سے جہاں علماء میں خوداعتمادی اوراحساسِ برتری پیدا ہوگا، وہیں جب وہ مدارس کے پُرسکون ماحول سے نکل کر معاشرے کی متحرک فضاء میں داخل ہوں گے تو نہ اس میں اپنے آپ کواجنبی محسوس کریں گےاور نہ ہی احساسِ کمتری کا شکار ہوں گے، بلکہ نہایت بے باکی کے ساتھ جاہلیت کی آنکھ میں آنکھ

ڈال کر گفتگو کریں گے۔

دینی مدارس کی اصلاح کے ساتھ ساتھ ہمیں مختلف مسلم کالجز اور عصری علوم کی بے شمار درسگاہیں قائم کرکے ان میں ایسا نصاب جاری کرنا ہے جو عصری اور سائنسی علوم کو سمیٹنے کے ساتھ ساتھ قرآن وسنت کے معارف اور علومِ نبوت کی روح سے پوری طرح سرشار ہو۔ مسلمانوں کی تعلیم میں پیچھے رہنے اور ان کی پسماندگی کے جہاں بہت سے اسباب ہیں، وہیں یہ سب بھی کچھ کم نہیں کہ ہندوستان کی دوسری بڑی اکثریت ہونے کے باوجود بھی آج تک منظّم طور سے ایسی تعلیمی منصوبہ بندی نہ کرسکے جو اُن کی دینی ودنیوی ترقی کا باعث بنتی، جبکہ ہمارے ملک کی بہت چھوٹی اقلیت عیسائیت نے حیرت انگیز طور پر پورے ملک میں اپنے تعلیمی مشن کا جال بچھا رکھا ہے، اور ہماری صورتِ حال یہ ہے کہ اسلامی کالجز نہ ہونے کے باعث جہاں بہت سے مسلم طلباء تعلیم سے محروم رہ جاتے ہیں، وہیں ہمارے ذہین طلباء حریفوں کے ان کالجوں میں اپنا مستقبل تاریک بنا کر لوٹتے ہیں جہاں ان کی حوصلہ شکنی کے پورے اسباب فراہم ہیں۔

اپنی ان ہی کوتاہیوں کی بنا پر ہم تعلیم میں اتنے پیچھے رہ گئے ہیں کہ ملک کے مشہور صحافی ''کلدیپ نیّر'' کو یہ کہنے کی جرأت ہوسکی کہ ''مسلمان تعلیمی میدان میں ہندوؤں سے دوسوسال پیچھے ہیں۔''

اگر ہمارے اندر کچھ بھی غیرت ہے تو ''کلدیپ نیّر'' کے اس ریمارک کا جواب دینے کے لیے کمر کس لیں اور تعلیمی پسماندگی کے خلاف اتنا مجاہدہ کریں کہ معاشرہ میں پھر کبھی اس کی پرچھائیں بھی نظر نہ آئے۔

اپنے دین سے مکمل وابستگی کی ضرورت

ان حقائق کے علاوہ ہمیں اس نکتہ کو بھی سمجھنا ہے کہ ملت کی پسماندگی میں جہاں تفرقہ بازی، جہالت وغباوت اور اقتصادی بحران کارفرما ہے، وہیں آزادخیالی، بے راہ روی اور دین سے حددرجہ دوری نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان ہی بیماریوں کی بدولت اُمتِ مسلمہ ایک نازک دور سے گزر رہی ہے اور مغربی افکار سے نوجوانوں کی آنکھیں خیرہ ہورہی ہیں، مسلم معاشرہ میں ایک افراتفری، بے چینی اور عجیب مایوسی کا عالم ہے، بزمِ اقوام میں ہم سمندر کی جھاگوں کی طرح بے وزن ہوچکے ہیں، حریف قومیں ہمیں لقمۂ تر کی طرح نگل جانا چاہتی ہیں اور وہ ہماری غیرت وحمیت کو للکار کر اس طرح ہم پر ٹوٹ پڑ رہی ہیں جس طرح بھوکے دسترخوان پر جاگرتے ہیں، اسی حالت کی منظر کشی کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشن گوئی کی تھی:

''عَنْ ثَوْبَانَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ - صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ -: یُوْشِکُ الْأُمَمُ أَنْ

تَدَاعٰی عَلَیْکُمْ کَمَا تَدَاعَی الْأَکَلَةُ إِلٰی قَصْعَتِهَا. فَقَالَ قَائِلٌ: وَمِنْ قِلَّةٍ نَحْنُ یَوْمَئِذٍ؟ قَالَ: بَلْ أَنْتُمْ یَوْمَئِذٍ کَثِیْرٌ وَلٰکِنَّکُمْ غُثَاءٌ کَغُثَاءِ السَّیْلِ وَلَیَنْزَعَنَّ اللّٰهُ مِنْ صُدُوْرِ عَدُوِّکُمُ الْمَهَابَةَ مِنْکُمْ وَلَیَقْذِفَنَّ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِکُمُ الْوَهْنَ. فَقَالَ قَائِلٌ: یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! وَمَا الْوَهْنُ؟ قَالَ: حُبُّ الدُّنْیَا وَکَرَاهِیَةُ الْمَوْتِ.'' (سنن أبی داود)

ترجمہ: ''حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عنقریب ایک ایسا وقت آئے گا کہ دیگر قومیں جمع ہوکر تمہارے اوپر اس طرح ٹوٹ پڑیں گی جس طرح کھانا کھانے والے اپنے کھانے کے پیالے کے ارد گرد جمع ہوجاتے ہیں! کسی نے سوال کیا کہ کیا یہ اس وجہ سے کہ اس وقت ہماری تعداد کم ہوگی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلکہ تمہاری تعداد تو اس وقت کافی زیادہ ہوگی، البتہ تمہاری حیثیت سیلاب کے تنکوں کی طرح ہوگی، اور تمہارے دشمن کے دل سے تمہارا رُعب نکل جائے گا، اور اللہ تمہارے دلوں میں ''وَهْن'' پیدا کرے گا، کسی نے سوال کیا کہ یارسول اللہ! ''وَهْن'' کیا ہوتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دنیا کی محبت اور موت سے نفرت کو ''وَهْن'' کہا جاتا ہے۔''

یہ دنیا سے محبت اور موت سے نفرت ہی تو ہے جس کی وجہ سے دورِ حاضر کے مسلمان صحابہؓ کے کردار وعمل، قرآنی فکر وشعور اور نبوی مزاج سے دست بردار ہوکر قرنِ اول سے پوری طرح کٹ چکے ہیں، وہ دیگر قوموں کی طرح کھانے پینے اور آرام وآسائش کا سامان جمع کرتے کرتے یہ بھول ہی گئے کہ حاملینِ شریعت ہونے کی بنا پر قرآن وسنت کی رو سے ہم پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ لائحۂ عمل کے باب میں آکر اس طرف بھی خصوصی توجہ دینی ہے کہ جہاں مسلمانوں کے کردار وعمل کی تعمیر، اعتماد و یقین کی تخم ریزی اور ان کی مکمل اسلامی ذہن سازی کی جائے وہیں ان کا اسلام سے رشتہ جوڑ کر عظیم ذمہ داریوں کا احساس دلایا جائے اور ہماری پوری یہ کوشش ہونی چاہیے کہ ہم معاشرہ کو اتنا دین دار بنادیں کہ اس کے ہر فرد کے وجود سے یہ خاموش صدا آرہی ہو:

''إِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُکِيْ وَمَحْیَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔'' (الانعام:۱۶۲)

''بے شک میری نماز اور میری تمام عبادات اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ کے لیے ہے جو سارے جہاں کا پروردگار ہے۔''

اگر ہم نے ان بنیادوں پر اس کی عمارت اُٹھادی اور معاشرہ کو پورے طور پر اسلامی سانچہ میں ڈھال دیا تو نہ کوئی باطل نظریہ ہمیں مرعوب کرسکے گا، نہ کوئی قوم ہمارے تشخص پر شب خون مارے گی اور نہ ہی دنیا کی کوئی طاقت ہمیں قیادت سے دست بردار کرسکے گی: ''وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ کُنْتُمْ

مُّؤْمِنِيْنَ‘‘ ...’’اور تم ہی غالب رہو گے بشرطیکہ تم سچے مسلمان رہو۔‘‘

دعوت وتبلیغ کا اہتمام

اپنی ان خامیوں کو دور کرنے، ملت کی صفوں میں اتحاد پیدا کرنے، عصری علوم حاصل کرنے اور دین کو مضبوطی سے پکڑ لینے کے بعد ہمیں پھر اس ذمہ داری کی طرف پلٹنا ہے جو آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حاملینِ قرآن وسنت کے ہونے کی بنا پر ہمارے کاندھوں پر ڈالی تھی، یعنی دعوت وتبلیغ۔

دوسری ذمہ داریوں کی طرح یہ بھی وہ مظلوم فریضہ ہے جسے ہم نے ایک دائرے میں محدود کر کے عرصہ دراز سے اس کے ہمہ گیر پہلوؤں کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ ہندوستان میں ایک ہزار سال سے بسنے کے باوجود ہم اپنے طاقتور پیغام، محکم تعلیم اور عہد آفریں دعوت سے بھی اس قوم کو واقف نہ کرا سکے جو سینکڑوں سال سے ہمارے پڑوس میں رہتی ہے۔

کل قیامت میں اگر یہی قوم ہم پر دعویٰ کر دے کہ خدارا! یہ لوگ برسہا برس تک ہمارے پڑوس میں رہے، لیکن تیرے پیغام کو ہم تک نہ پہنچا سکے جو بطورِ امانت تو نے انہیں سونپ رکھا تھا تو ہمارے پاس اس کا کیا جواب ہوگا؟

اس لیے نبوت کی اس امانت کو دوسری قوموں تک پہنچانے اور خداوندِ قدوس کی پکڑ سے بچنے کے لیے منظّم طور پر مقامی زبان میں معروضی لٹریچر پیش کیا جانا وقت کی ایسی ضرورت بن چکا ہے جس کے بغیر اسلام کا تعارف کرانے اور ان غلط فہمیوں کا ازالہ ناممکن ہے جو عرصہ دراز سے برادرانِ وطن کے درمیان چلی آرہی ہے۔

دعوت کے اسی مرحلہ کو عبور کرنے کے لیے ہم نے سیکولرزم سے ایک وقتِ مقررہ تک سمجھوتہ کیا ہے، تاکہ مذہبی آزادی کی دفعات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہم معاشرہ کو مکمل طور سے اسلامی بنیادوں پر قائم کر دیں، اس لیے ان حکمتوں کے پیشِ نظر ہمیں نہایت تیزی کے ساتھ دعوت وتبلیغ کی جانب پیش رفت کرنی چاہیے اور جہاں اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کو دور کر کے معاشرہ کی اصلاح کرتے ہوئے ہم دینی تعلیمات پر عمل پیرا ہوں وہیں ملت کے ہر ہر فرد کے دل ودماغ میں یہ بات پوری قوت سے اُتار دیں کہ اتحاد وتعلیم اور تبلیغ ودعوت ہی وہ شہپر ہیں جن سے فلاح وترقی کا شاہین پرواز کرتا ہے۔

وصلی اللّٰہ تعالٰی علٰی سیّدنا محمد وعلٰی آلہٖ وصحبہٖ أجمعین والحمد للّٰہ ربّ العالمین

حضرت ابراہیم علیہ السلام

ایک برگزیدہ نبی اور رسول

ڈاکٹر مفتی محمد نجیب قاسمی سنبھلی
فاضل دارالعلوم دیوبند، انڈیا

حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام جو اللہ کے برگزیدہ نبی اور پیغمبر ہیں، جن کو خلیل اللہ (اللہ کا دوست) کہا جاتا ہے، تقریباً چار ہزار سال قبل عراق میں پیدا ہوئے۔ تین بڑے مذاہب (یہودیت، عیسائیت اور اسلام) کے عظیم پیغمبروں میں سے ایک ہیں۔ یہودی اور عیسائی بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا پیشوا مانتے ہیں۔ مذہبِ اسلام میں ان کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، چنانچہ قرآن کریم کی چودھویں سورت ''سورۂ ابراہیم'' ان ہی سے موسوم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں متعدد جگہوں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے احوال واوصاف بیان فرمائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں انہیں ''اُمت'' اور ''امام الناس'' کے لقب سے پکارا ہے اور انہیں متعدد مرتبہ ''حنیف'' بھی کہا ہے۔ قرآن کریم میں انہیں ''مسلم'' بھی کہا گیا ہے۔ قرآن کریم میں بہت سارے ایسے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا تذکرہ ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں سے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو بچپن سے ہی قلبِ سلیم عطا کیا گیا تھا، چنانچہ انہوں نے ابتدا ہی سے بت پرستی کی مخالفت کی۔ اللہ کی مخلوقات میں غور وفکر کے بعد انہیں یقین ہوگیا تھا کہ ساری کائنات کو پیدا کرنے والا ایک معبودِ حقیقی ہے، جس کا کوئی شریک نہیں ہے، جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے:

> ''اور اس طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی سلطنت کا نظارہ کراتے تھے، اور مقصد یہ تھا کہ وہ مکمل یقین رکھنے والوں میں شامل ہوں، چنانچہ جب ان پر رات چھائی تو انہوں نے ایک ستارہ دیکھا، کہنے لگے: یہ میرا رب ہے، پھر جب وہ ڈوب گیا تو انہوں نے کہا: میں ڈوبنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ پھر جب انہوں نے چاند کو چمکتے دیکھا تو کہا کہ: یہ میرا رب ہے، لیکن جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہنے لگے: اگر میرا رب مجھے ہدایت نہ دے تو میں یقیناً

گمراہ لوگوں میں شامل ہوجاؤں، پھر جب انہوں نے سورج کو چمکتے دیکھا، تو کہا: یہ میرا رب ہے، یہ زیادہ بڑا ہے، پھر جب وہ غروب ہوا تو انہوں نے کہا: اے میری قوم! جن جن چیزوں کو تم اللہ کی خدائی میں شریک قرار دیتے ہو، میں اُن سب سے بیزار ہوں۔ میں نے تو پوری طرح یکسو ہوکر اپنا رُخ اُس ذات کی طرف کرلیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔'' (سورۃ الانعام:۷۴-۷۹)

حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مرنے کے بعد زندہ ہونے کی بابت جب سمجھنا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے پرندوں کی مثال کے ذریعہ اُن کو یہ راز سمجھایا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرہ میں بیان فرمایا ہے:

''اور (اس وقت کا تذکرہ سنو) جب ابراہیم نے کہا تھا کہ میرے پروردگار! مجھے دکھایئے کہ آپ مردوں کو کیسے زندہ کرتے ہیں؟ اللہ نے کہا: کیا تمہیں یقین نہیں؟ کہنے لگے: یقین کیوں نہ ہوتا؟ مگر (یہ خواہش اس لیے کی ہے) تاکہ میرے دل کو اطمینان حاصل ہوجائے۔ اللہ نے کہا: اچھا تو چار پرندے لو اور انہیں اپنے سے مانوس کرلو، پھر (ان کو ذبح کرکے) ان کا ایک ایک حصہ ہر پہاڑی پر رکھ دو، پھر ان کو بلاؤ، وہ چاروں تمہارے پاس دوڑے چلے آئیں گے۔'' (سورۃ البقرۃ:۲۶۰)

ان کا والد آزر مذہبی پیشوا تھا، بت بنا کر بیچا کرتا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے زمانۂ طفولیت سے ہی بتوں کی عبادت کی مخالفت کی۔ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کھل کر بتوں کی مخالفت کے بعد ان کو قتل کرنے اور گھر سے نکالنے کی دھمکی دی گئی۔ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ایک عبادت گاہ میں گھس کر بڑے بت کے علاوہ تمام بتوں کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا واقعہ پیش آیا، جس کا ذکر قرآن کریم میں ہے:

''چنانچہ ابراہیم نے ان کے بڑے بت کے سوا سارے بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا، تاکہ وہ لوگ اُن کی طرف رجوع کریں، وہ کہنے لگے کہ: ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ حرکت کس نے کی ہے؟ وہ کوئی بڑا ہی ظالم تھا۔ کچھ لوگوں نے کہا: ہم نے ایک نوجوان کو سنا ہے کہ وہ ان بتوں کے بارے میں باتیں بنایا کرتا ہے، اسے ابراہیم کہتے ہیں۔ انہوں نے کہا: تو پھر اس کو سب لوگوں کے سامنے لے کر آؤ، تاکہ سب گواہ بن جائیں۔ (پھر جب ابراہیم علیہ السلام کو لایا گیا تو) وہ بولے: ابراہیم! کیا ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ حرکت تم ہی نے کی ہے؟ ابراہیم نے کہا: نہیں، بلکہ یہ حرکت ان کے اس بڑے سردار نے کی ہے۔ اب انہی بتوں سے پوچھ لو اگر یہ بولتے ہوں۔'' (سورۃ الانبیاء:۵۸-۶۳)

سورۃ الصافات، آیت: ۸۸-۸۹ میں مذکور ہے کہ وہ کوئی جشن کا دن تھا، جس میں ساری قوم شہر چھوڑ کر کہیں جایا کرتی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کے ساتھ جانے سے معذرت چاہی اور جب سارے لوگ چلے گئے تو بت خانے میں جا کر سارے بتوں کو توڑ ڈالا، صرف ایک بت کو چھوڑ دیا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی کلہاڑی بھی اس کی گردن میں لٹکا کر چھوڑ دی۔ اس عمل سے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مقصد یہ تھا کہ وہ لوگ اپنی آنکھوں سے ان بتوں کی بے بسی کا منظر دیکھ سکیں اور یہ سوچیں جو بت خود اپنا دفاع نہیں کر سکتے، وہ دوسروں کی کیا مدد کریں گے۔ اور پھر نمرود بادشاہ کے ساتھ مناظرہ ہوا، مناظرہ میں حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے منطقی جواب پر غور کرنے کے بجائے یہ شاہی فرمان جاری کیا گیا کہ اس کو جلا ڈالو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو۔ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو آتش نمرود میں ڈالے جانے کا واقعہ پیش آیا، مگر اللہ تعالیٰ کے حکم سے آگ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے ٹھنڈی ہونے کے ساتھ سلامتی اور آرام کی چیز بن گئی، جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے:

''وہ (ایک دوسرے سے) کہنے لگے: آگ میں جلا ڈالو اس شخص کو، اور اپنے خداؤں کی مدد کرو، اگر تم میں کچھ کرنے کا دم خم ہے۔ (چنانچہ انہوں نے ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈال دیا اور) ہم نے کہا: اے آگ! ٹھنڈی ہو جا، اور ابراہیم کے لیے سلامتی بن جا۔'' (سورۃ الانبیاء ۶۸-۶۹)

غرضیکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے وہ آگ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکی۔ اس قوم کی بدنصیبی کی حد یہ تھی کہ اتنا بڑا معجزہ دیکھنے کے باوجود ایک آدمی بھی ایمان نہیں لایا، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام عراق چھوڑ کر ملکِ شام تشریف لے گئے، وہاں سے فلسطین چلے گئے اور وہیں مستقل قیام فرما کر اسی کو دعوت کا مرکز بنایا۔

ایک مرتبہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی بیوی حضرت سارہؓ کے ہمراہ مصر تشریف لے گئے، وہاں کے بادشاہ نے حضرت ہاجرہؓ کو حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اہلیہ حضرت سارہؓ کی خدمت کے لیے پیش کیا۔ اس وقت تک حضرت سارہؓ کی کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی، مصر سے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام پھر فلسطین واپس تشریف لائے۔ حضرت سارہؓ نے خود حضرت ہاجرہؓ کا نکاح حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ کروا دیا۔ بڑھاپے میں حضرت ہاجرہؓ کے بطن سے حضرت اسماعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام پیدا ہوئے، کچھ عرصہ بعد حضرت سارہؓ کے بطن سے حضرت اسحاق علیہ الصلوٰۃ والسلام پیدا ہوئے۔

اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی بیوی حضرت ہاجرہؓ اور بیٹے حضرت اسماعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مکہ مکرمہ کے چٹیل میدان میں بیت اللہ کے قریب چھوڑ دیا، جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے:

''اے ہمارے پروردگار! میں نے اپنی کچھ اولاد کو آپ کے حرمت والے گھر کے پاس ایک ایسی وادی میں لا بسایا ہے جس میں کوئی کھیتی نہیں ہوتی۔ ہمارے پروردگار! (یہ میں نے اس لیے کیا) تاکہ یہ نماز قائم کریں، لہٰذا لوگوں کے دلوں میں ان کے لیے کشش پیدا کردیجئے اور ان کو پھلوں کا رزق عطا فرمائیے، تاکہ وہ شکرگزار بنیں۔'' (سورۂ ابراہیم:۳۷)

حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعا ایسی قبول ہوئی کہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے دل مکہ مکرمہ کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں، چنانچہ ہر مسلمان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ کم از کم ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ کے گھر کی ضرور زیارت کرے، اور پھلوں کی افراط کا یہ عالم ہے کہ دنیا بھر کے پھل بڑی تعداد میں وہاں موجود ہیں۔ جب کھانے پینے کے لیے کچھ نہ رہا تو حضرت ہاجرہؓ بے چین ہوکر قریب کی صفا اور مروہ پہاڑیوں پر پانی کی تلاش میں دوڑیں، چنانچہ پانی کا چشمہ زمزم جاری ہوا۔ کچھ مدت کے بعد ایک قبیلہ بنو جرہم کا ادھر سے گزر ہوا، پانی کی سہولت دیکھ کر انہوں نے حضرت ہاجرہؓ سے قیام کی اجازت چاہی، حضرت ہاجرہؓ نے وہاں قیام کرنے کی اجازت دے دی۔

حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خواب میں دکھایا گیا کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ذبح کررہے ہیں۔ نبی کا خواب سچا ہوا کرتا ہے، چنانچہ اللہ کے اس حکم کی تکمیل کے لیے فوراً فلسطین سے مکہ مکرمہ پہنچ گئے، جیسا کہ سورۃ الصافات میں فرمانِ الٰہی ہے:

''پھر جب وہ لڑکا ابراہیم کے ساتھ چلنے پھرنے کے قابل ہوگیا تو انہوں نے کہا: بیٹے! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تمہیں ذبح کررہا ہوں، اب سوچ کر بتاؤ، تمہاری کیا رائے ہے؟''

جب باپ نے بیٹے کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہیں ذبح کرنے کا حکم دیا ہے تو فرمانبردار بیٹے اسماعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کا جواب تھا:

''ابا جان! جو کچھ آپ کو حکم دیا جارہا ہے، اسے کرڈالیے۔ ان شاء اللہ! آپ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے۔'' (سورۃ الصافات:۱۰۲)

اور پھر اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تاریخِ انسانی کا وہ عظیم الشان کارنامہ انجام دیا جس کا مشاہدہ نہ اس سے پہلے کبھی زمین وآسمان نے کیا، اور نہ اس کے بعد کریں گے۔ اپنے دل کے ٹکڑے کو منہ کے بل زمین پر لٹادیا، چھری تیز کی، آنکھوں پر پٹی باندھی اور اُس وقت تک پوری طاقت سے چھری اپنے بیٹے کے گلے پر چلاتے رہے، جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ صدا نہ آگئی:

''اے ابراہیم! تو نے خواب سچ کردکھایا، ہم نیک لوگوں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں۔'' (الصافات:۱۰۵)

چنانچہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی جگہ جنت سے ایک مینڈھا بھیج دیا گیا جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ذبح کردیا۔اس واقعہ کے بعد سے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے جانوروں کی قربانی کرنا خاص عبادت میں شمار ہوگیا، چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے لیے بھی ہرسال قربانی نہ صرف مشروع کی گئی، بلکہ اس کو اسلامی شعار بنایا گیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اتباع میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر جانوروں کی قربانی کا یہ سلسلہ کل قیامت تک جاری رہے گا، ان شاء اللہ!

اس عظیم امتحان میں کامیابی کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ دنیا میں میری عبادت کے لیے گھر تعمیر کرو، چنانچہ باپ بیٹے نے مل کر بیت اللہ شریف (خانہ کعبہ) کی تعمیر کی، جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے:

''اور اس وقت کا تصور کرو جب ابراہیم بیت اللہ کی بنیادیں اُٹھار ہے تھے، اور اسماعیل بھی (ان کے ساتھ شریک تھے اور دونوں یہ کہتے جاتے تھے کہ:) اے ہمارے پروردگار! ہم سے (یہ خدمت) قبول فرمالے۔'' (سورۃ البقرۃ:۱۲۷)

بیت اللہ کی تعمیر سے فراغت کے بعد اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ لوگوں میں حج کا اعلان کردو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حج کا اعلان کیا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اعلان نہ صرف اس وقت کے زندہ لوگوں تک پہنچادیا، بلکہ عالم ارواح میں تمام روحوں نے بھی یہ آواز سنی، جس شخص کی قسمت میں بیت اللہ کی زیارت لکھی تھی، اس نے اس اعلان کے جواب میں لبیک کہا۔فرمانِ الٰہی ہے:

''اور لوگوں میں حج کا اعلان کرو کہ وہ تمہارے پاس پیدل آئیں، اور دور دراز کے راستوں سے سفر کرنے والی ان اونٹنیوں پر سوار ہوکر آئیں جو (لمبے سفر سے) دبلی ہوگئی ہوں۔'' (الحج:۲۷)

دنیا کے کونے کونے سے لاکھوں عازمینِ حج ' حج کا ترانہ یعنی لبیک پڑھتے ہوئے مکہ مکرمہ پہنچ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقہ پر حج کی ادائیگی کرکے اپنا تعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عظیم قربانیوں کے ساتھ جوڑتے ہیں۔ حج کو اسی لیے عاشقانہ عبادت کہتے ہیں، کیونکہ حاجی کے ہر عمل سے وارفتگی اور دیوانگی ٹپکتی ہے۔ حج اس لحاظ سے بڑی نمایاں عبادت ہے کہ یہ بیک وقت روحانی، مالی اور بدنی تینوں پہلوؤں پر مشتمل ہے، یہ خصوصیت کسی دوسری عبادت کو حاصل نہیں ہے۔

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

شرعی عائلی احکام کی دفعہ بندی:

مفتی شعیب عالم
اُستاذ ومفتی دارالافتاء جامعہ

قانونِ حضانت (پانچویں قسط)

دفعہ۸۔ذوی الارحام کا حقِ حضانت:

(۱) دفعہ۴، ۵، ۶ اور ۷ میں مذکور مستحقینِ حضانت کی عدم موجودگی یا غیر آمادگی یا عدمِ اہلیت کی صورت میں پرورش کا حق درج ذیل ترتیب کے مطابق ذوی الارحام کو ہوگا:

الف۔ ماں کا باپ — ب۔ اخیافی بھائی
ج۔ اخیافی بھائی کا بیٹا — د۔ ماں کا چچا
ھ۔ حقیقی ماموں — و۔ پدری ماموں
ز۔ مادری ماموں

(۲) ذوی الارحام ’’الأقرب فالأقرب‘‘ کے اصول کے تحت حضانت کے حق دار ہوں گے۔

(۳) اگر ایک ہی درجہ میں ایک سے زائد مستحق حضانت اشخاص جمع ہو جائیں اور سب ہی اہل اور پرورش کے خواہاں ہوتو جو زیادہ بہتر ومناسب ہو وہ مقدم ہوگا پھر جو زیادہ پرہیزگار ہو پھر جو زیادہ عمر رسیدہ ہو۔

(۴) چچازاد، پھوپھی زاد، ماموں زاد اور خالہ زاد بہنوں کو حق حضانت حاصل نہ ہوگا، خواہ زیر حضانت اور حاضنہ کی جنس ایک ہو یا مختلف۔

(۵) ذوی الارحام سے مراد یہ ہے کہ جو:

الف۔ عصبہ نہ ہوں — ب۔ ذی رحم ہوں
ج۔ محرم ہوں

دفعہ۹۔ پرورش کنندہ کی اہلیت:

(۱) پرورش کنندہ ماں ہو یا اس کی کوئی عزیزہ یا کوئی مرد ہو، لازم ہے کہ درج ذیل صفات کا حامل ہو:

الف: آزاد ہو ب: عاقل ہو

ج: بالغ ہو د: قابل اعتماد ہو

ھ: پرورش پر قدرت رکھتا ہو

و: ایسے فسق میں مبتلا نہ ہو جس کے سبب بچے کے ضیاع کا اندیشہ ہو

ز: بچہ کا ذی رحم محرم ہو۔

(۲) پرورش کنندہ عورت ہو تو مزید شرط ہوگا کہ:

الف: بچے کے غیر ذی رحم محرم سے نکاح نہ کرلے یا ایسے شخص کے نکاح میں نہ ہو۔

ب: خود بچے کی ذو رحم محرم ہو۔

ج: بچے کو زیر پرورش لینے پر آمادہ ہو۔

د: بچے کو نفرت والے ماحول میں نہ رکھے۔

ھ: مرتدہ نہ ہو۔

و: قانون ہذا کے احکام کے تحت بچے کی مفت پرورش سے انکار نہ کرتی ہو جب کہ کوئی اور حضانت کا اہل رضا کارانہ پرورش پر آمادہ ہو۔

ز: قانون ہذا کے احکام کے تحت بچے کو ولی کی مرضی کے خلاف دور منتقل نہ کیا ہو۔

(۳) پرورش کنندہ عصبہ ہو تو شرط ہوگا کہ:

اس کا اور بچے کا دین ایک ہو۔

توضیح ۱۔ اگر پرورش کنندہ مکاتبہ ہو تو اسے معاہدہ کتابت کے بعد پیدا ہونے والے بچہ کا حق پرورش حاصل ہوگا۔

توضیح ۲۔ اگر پرورش کنندہ مراہق ہو تو اسے حق حضانت حاصل ہوگا بشرطیکہ وہ مراہقت کا دعوی بھی کرتا ہو۔

توضیح ۳۔ عصبہ میں سے چچازاد کو باوجود عدم محرمیت کے لڑکے کی پرورش کا حق ہوگا تاہم غیر محرم عصبہ کو بچی کی پرورش کا حق نہ ہوگا الا یہ کہ دیگر اہل اشخاص کی عدم موجودگی یا عدم رضامندی یا عدم اہلیت کی بنا پر عدالت اسے موزوں تصور کرے۔

توضیح ۴۔ اگر مستحق حضانت درج بالا شرائط میں سے کوئی ایک شرط بھی کھو دے تو اس کا حق حضانت ساقط ہو جاتا ہے۔

(جاری ہے)

مذہبی القابات اور ہماری بے اعتدالیاں

مولانا سید انور شاہ
اُستاذ جامعہ بیت السلام، لنک روڈ، کراچی

اسلام جہاں غلو، غلط بیانی اور بے جا مبالغہ سے منع کرتا ہے، وہی ہر معاملے میں راہِ اعتدال اپنانے کی تاکید کرتا ہے۔ یہی دینِ اسلام کی ایک بڑی خوبی ہے کہ اس نے اعتدال، توسط اور میانہ روی کی تلقین کی ہے اور ہمیں اُمتِ وسط بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ اعتدال اپنانے والوں کو کبھی بھی گمراہی اور پچھتاوے کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ اس کے برعکس وہ لوگ جو اعتدال کے دامن کو چھوڑ کر دوسری راہ اختیار کیے ہوئے ہیں، وہ یا تو افراط کا شکار ہوکر گمراہ ہوجاتے ہیں یا پھر تفریط کی کھائی میں جا گرتے ہیں۔ اسی طرح دینِ اسلام سادگی اور للّٰہیت کو بڑی اہمیت دیتا ہے، جبکہ نام ونمود، دکھاوے اور نمائش کی مذمت کرتا ہے۔

آج کل ہمارے معاشرے میں مذہبی القاب کے استعمال کرنے میں جو بے اعتدالیاں پائی جارہی ہیں، وہ کسی پر اوجھل نہیں۔ نام کے آگے القابات پر القابات جڑ دیے جاتے ہیں، خواہ وہ شخص ان صفات کا حامل ہو یا نہ ہو۔ آئے روز نئے سے نئے اور بڑے سے بڑے القابات سامنے آتے ہیں۔ بعض اوقات تو جلسوں میں اور بعض دیگر مجالس میں امیروں، وزیروں، عہدیداروں، پیروں اور خصوصاً علماء کی تعریفوں میں زمین وآسمان کے قلابے ملا دیئے جاتے ہیں، مثلاً کسی کے لیے حجۃ الاسلام، کسی کے لیے شیخ الاسلام، کسی کے لیے شیخ الفقہ، کسی کے لیے شیخ الحدیث، کسی کے لیے مفتی اعظم، کسی کے لیے خطیب بے بدل، خطیبِ زماں، نمونۂ اسلاف، محققِ دوراں، محقق العصر، علامۃ العصر، محدث العصر، فقیہِ زماں، جامعِ علوم عقلیہ ونقلیہ، شیخ المشائخ، اعلیٰ حضرت، مفکرِ اسلام، غزالیِ وقت، غزالیِ دوران، شہنشاہِ خطابت، محقق علی الاطلاق، محدثِ اعظم، شیخ الجامعہ، ولیِ کامل، رہبرِ شریعت، ثانیِ جنیدؒ، وغیرہ وغیرہ۔

افسوس ناک بات یہ ہے کہ بعض حضرات تو باقاعدہ اپنے حلقۂ احباب کو اس طرح بڑے بڑے القاب اپنے نام کے ساتھ لگانے کی تاکید کرتے ہیں، اور القاب کے بغیر پکارے جانے پر بے التفاتی

اور ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں۔ اور اب تو معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ علمائے کرام کی اکثر مجالس اس قسم کے القابات سے گونجتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مذہبی القابات کے متعلق یہی بے اعتدالیاں‘ پمفلٹوں اور اشتہارات میں بھی واضح طور پر نظر آتی ہیں۔ اور نہایت بے احتیاطی کے ساتھ شریعت کے تقاضوں کو فراموش کیا جارہا ہے۔ ایک طرف تو یہ معاملہ ہے، جبکہ دوسری طرف کچھ حضرات ایسے بھی ہیں جو اپنے لیے ایسے القاب تجویز کرتے ہیں جس سے گناہ گاری ٹپکتی ہو، جیسے: العبد العاصی، عاصی وغیرہ، حالانکہ یہ بھی درست نہیں۔ یہ ساری باتیں اور احکام سمجھنے کے ہیں۔ ان کے نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگ افراط وتفریط اور متضاد پہلوؤں کا شکار ہیں۔ اس موضوع پر انتہائی عمدہ اور تفصیلی گفتگو علامہ ابن الحاج المالکی المصریؒ نے اپنی مشہور کتاب ’’**المدخل**‘‘ کی پہلی جلد ’’**فصل فی ذکر النعوت**‘‘ کے تحت فرمائی ہے۔ واضح رہے کہ علامہ ابن الحاجؒ کا شمار مسلک مالکیہ کے مشہور اور بڑے فقہاء میں ہوتا ہے: ’’**وقد ذكره السيوطيؒ في من كان بمصر من فقهاء المالكية**۔‘‘ (حسن المحاضرۃ، السیوطی، ج:۱،ص:۳۸۲) ان کی وفات مصر کے مشہور شہر قاہرہ میں ہوئی۔ ’’**المدخل**‘‘ فقہ مالکیہ کی نہایت معتبر اور انفع کتاب ہے۔

القابات کے ارتقاء کا پس منظر

علامہ ابن الحاج المالکی المصریؒ ان القاب کے رائج ہونے کے اسباب بیان کرتے ہیں:

’’ان کی ترویج میں سب سے بڑا کردار عجمیوں کا رہا ہے، اور وہ اس طرح کہ جب ترک مسندِ خلافت پر غالب آگئے، اور حکومت کی باگ ڈور خود سنبھال لی، تو انہوں نے اپنے لیے مختلف قسم کے القابات اختیار کر لیے، جیسے: شمس الدولۃ، ناصر الدولۃ، نجم الدولۃ وغیرہ، چونکہ ان القابات کا استعمال حکومت کے مناصب پر فائز بڑے بڑے عہدے داروں کے لیے ہوتا تھا، اس لیے لوگ ان القاب کو باعثِ عظمت وفخر سمجھنے لگے، اس وجہ سے عام لوگوں نے ان میں انتہائی دلچسپی ظاہر کی۔ لیکن حکومت میں منصب اور عہدہ نہ ہونے کی بنا پر ان کے لیے اپنے لیے ان القاب کا رکھنا ممکن نہیں تھا، چنانچہ جب انہوں نے اس کے حصول کے لیے کوئی راستہ نہیں پایا تو اب انہوں نے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے مذہب کا راستہ اختیار کرلیا: ’’نجم الدولۃ نہ سہی تو نجم الدین ہی سہی۔‘‘

اس زمانے میں ان القابات کی انتہائی اہمیت اور وقعت تھی اور بڑی باعثِ عظمت اور قابلِ فخر چیز تھی۔ یہی وجہ تھی کہ حکومت نے ان ناموں اور القاب کے رکھنے پر سخت پابندی عائد کی تھی، لہٰذا جب کوئی اپنی اولاد کے لیے اس قسم کا لقب رکھنا چاہتا تو اسے حکومت کو ایک بھاری رقم ادا کرنی ہوتی، اور حکومت سے باقاعدہ اجازت نامہ لینا ہوتا۔ یوں ہی لوگ حکومت کی مقرر کردہ بھاری رقم ادا کرتے تھے اور اپنی اولاد کے لیے اس قسم کے القاب تجویز کرتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد خلافتِ عباسیہ پر ترک

نے مکمل طور پر قابض ہوکر ہر قسم کا کنٹرول اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ زمانہ گزرنے کے ساتھ ان القابات کی اہمیت باقی نہیں رہی؛ کیونکہ اب حکومت ان کے لیے ایک قسم کی لونڈی بن چکی تھی، اس لیے اب وہ مذہبی القابات میں کشش محسوس کرتے ہوئے ان کی طرف متوجہ ہوگئے اور ان کے لیے نجم الدولۃ کے بجائے نجم الدین جیسے القاب زیادہ باعثِ عظمت وفخر بن گئے۔ اس دوران حکومت نے پابندی ختم کرکے عام لوگوں کو کھلی چھوٹ دے دی۔ یہ القابات اس قدر تیزی کے ساتھ رائج ہوگئے کہ کوئی بھی اس کی زد سے محفوظ نہیں رہا، امیر غریب، چھوٹے بڑے سب اس وبا کی زد میں آگئے، یہ معاملہ اس سطح پر پہنچ گیا کہ علماء نے بھی اس سے مانوس ہوکر ان کے رکھنے میں کوئی برائی محسوس نہیں کی اور لوگوں سے متاثر ہوکر ان کو قبول کرنے لگے۔'' (المدخل، ج:۱،ص:۱۱۰،فصل فی النعوت) القابات کی اس ترویج کے متعلق علامہ ابن خلدون نے بھی مقدمہ تاریخ ابنِ خلدون میں اس کے قریب قریب گفتگو فرمائی ہے۔

مذہبی القابات کی شرعی حیثیت

قرآن کریم اور احادیثِ طیبہ سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے تزکیہ کا اعلان کرے، یا اپنے لیے ایسے القاب اختیار کرے جس میں پاکیزگی اور تقدس کا پہلو پایا جاتا ہو، چنانچہ ذیل میں اس کے متعلق چند آیاتِ کریمہ مفسرین کی تشریح کی روشنی میں ملاحظہ فرمایئے:

۱:-''أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ أَنْفُسَهُمْ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلاً۔'' (النساء:۴۹)

''کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنے آپ کو بڑا ہی پاکیزہ بتاتے ہیں؟ حالانکہ پاکیزگی تو اللہ جس کو چاہتا ہے عطا کر دیتا ہے، اور کسی پر اس عطا میں ایک دھاگے کے برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔''

اس آیت کے شانِ نزول میں مفسرین لکھتے ہیں کہ:

''یہود اپنے آپ کو بڑے پاکیزہ اور مقدس بتلاتے تھے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور محبوب ترین لوگ ہیں۔ اس آیتِ کریمہ میں ان کی مذمت کی گئی ہے کہ ذرا ان لوگوں کو دیکھو! جو اپنی پاکی بیان کررہے ہیں، ان پر تعجب کرنا چاہیے۔''

اس آیتِ کریمہ کے تحت حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''معلوم ہوا کہ اپنے کو پاک باز کہنا اور تقدس کا دعویٰ کرنا صریح گناہ ہے۔'' (معارف القرآن:۲)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر ''معارف القرآن'' میں اس آیت کے متعلق عنوان باندھا ہے: ''اپنی مدح سرائی اور عیوب سے پاک ہونے کا دعویٰ جائز نہیں۔'' پھر نیچے لکھتے ہیں:

''اس سے معلوم ہوا کہ کسی کو اپنی یا دوسروں کی پاکی بیان کرنا جائز نہیں ہے۔ یہ ممانعت

تین وجہ سے ہے:

۱:-اپنی مدح کا سبب اکثر کبر ہوتا ہے، تو حقیقت میں ممانعت کبر سے ہوئی۔

۲:-یہ کہ خاتمہ کا حال اللہ کو معلوم ہے کہ تقویٰ وطہارت پر ہوگا یا نہیں، اس لیے اپنے آپ کو مقدس بتلانا خلافِ خوفِ الٰہی ہے۔

۳:-ممانعت کی تیسری وجہ یہ ہے کہ اکثر اوقات اس دعوی سے لوگوں کو یہ وہم ہونے لگتا ہے کہ یہ آدمی اللہ کے ہاں اس لیے مقبول ہے کہ یہ تمام نقائص اور عیوب سے پاک ہے، حالانکہ یہ جھوٹ ہے، کیونکہ بہت سے عیوب بندہ میں موجود ہوتے ہیں۔'' (معارف القرآن، ج:۲،ص:۴۳۰)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ ''بیان القرآن'' میں لکھتے ہیں:

''اس میں دعوائے تقدس پر انکار ہے اور اس میں بجز اہلِ فنا کے بہت مشائخ مبتلا ہیں۔''

(بیان القرآن، ج:۱،ص:۳۶۱)

۲:-''فَلَا تُزَكُّوْا أَنْفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى۔'' (سورۃ النجم:۳۲)

''تم اپنی پاکیزگی مت بیان کرو، وہ خوب جانتا ہے کہ کون متقی ہے۔''

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ''بیان القرآن'' میں فرماتے ہیں کہ:

''اس آیتِ کریمہ میں دعوائے تقدس سے صریح ممانعت ہے۔'' (بیان القرآن، ج:۲،ص:۴۷۵)

حضرت مولانا عاشق الٰہی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر ''انوار البیان'' میں لکھتے ہیں:

''اپنا تزکیہ کرنا اور اپنی تعریف کرنا، یعنی اپنے اعمال کو اچھا بتانا اور اپنے اعمال کو بیان کر کے دوسروں کو معتقد بنانا، یا اپنے اعمال پر اترانا اور فخر کرنا، آیت کریمہ سے ان سب کی ممانعت معلوم ہوگئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا نام رکھنا بھی پسند نہ تھا جس سے اپنی بڑائی اور خوبی کی طرف اشارہ ہوتا ہو۔'' (انوار البیان، ج:۵،ص:۲۳۵)

حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی صاحبؒ ''معالم العرفان'' میں فرماتے ہیں:

''آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ امیروں، وزیروں، اور عہدیداروں کی ان کے حاشیہ بردار کتنی تعریفیں کرتے ہیں، ان کو سپاس نامے پیش کیے جاتے ہیں جس میں زمین وآسمان کے قلابے ملائے جاتے ہیں، آپ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ ایسے معاملے میں مبالغہ آرائی سے منع کیا گیا ہے، صرف حقیقت بیان کرنے کی اجازت ہے۔'' (معالم العرفان، ج:۱۷،ص:۴۱۸)

القابات میں مبالغہ آرائی احادیثِ طیبہ کی روشنی میں

القابات میں مبالغہ آرائی سے ممانعت پر اب چند احادیثِ طیبہ ملاحظہ فرمائیے:

۱:-ایک مرتبہ ایک شخص نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک دوسرے آدمی کی خوب مدح و تعریف کی، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وَیْحَکَ، قَطَعْتَ عُنُقَ صَاحِبِکَ.''.....''افسوس ہے تجھ پر، تو نے تو اپنے ساتھی کی گردن کاٹ دی۔'' پھر فرمایا کہ: اگر تمہیں کسی کی تعریف کرنی ہو تو ان الفاظ سے کرو کہ میرے علم کے مطابق یہ شخص نیک و متقی ہے۔ ''وَلَا أُزَکِّيْ عَلَى اللّٰهِ أَحَداً''یعنی''میں یہ نہیں کہتا کہ اللہ کے نزدیک بھی وہ ایسا ہی ہے جیسا میں سمجھ رہا ہوں۔'' (صحیح بخاری، کتاب الشہادات والادب۔مسلم، کتاب الزہد)

۲:-حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہمیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا:

''أَنْ نَّحْثُوَ فِيْ وُجُوْہِ الْمَدَّاحِيْنَ التُّرَابَ.''

''ہم تعریف کرنے والوں کے چہروں پر مٹی دیں، یعنی ان کو ناکام بنادیں۔''

۳:- ایک روایت میں ہے کہ حضرت زینب بن أبی سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ: تمہارا نام کیا ہے؟ چونکہ اس وقت میرا نام ''برّہ'' تھا (جس کے معنی ہیں نیک و گناہوں سے پاک عورت) میں نے وہی بتلایا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لَاتُزَکُّوْا أَنْفُسَکُمْ، اَللّٰہُ أَعْلَمُ بِأَھْلِ الْبِرِّ مِنْکُمْ ''(رواہ مسلم وبخاری، باب تحویل الاسم) یعنی ''تم اپنے آپ کی گناہوں سے پاکی بیان نہ کرو، کیونکہ یہ علم صرف اللہ ہی کو ہے کہ تم میں سے نیک اور پاک کون ہے۔'' پھر''برہ'' کے بجائے آپ نے زینب نام رکھا۔ مطلب یہ ہے کہ جب کسی کا نام ''برہ'' (نیک عورت) ہوگا تو اس سے جب دریافت کیا جائے گا کہ تم کون ہو؟ تو ظاہری بات ہے کہ وہ یہ کہے گی ''برّہ''یعنی میں نیک اور گناہوں سے پاک خاتون ہوں، اس میں چونکہ بظاہر صورتاً خود اپنی زبان سے نیک ہونے کا دعویٰ پایا جاتا ہے، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا۔

۴:-علامہ ابن الحاج مالکی رحمۃ اللہ علیہ نے ''سنن ابوداؤد'' کے حوالے سے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک وفد حاضر ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سنا کہ وہ اپنے سردار کو''ابوالحکم'' سے پکار رہے تھے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کنیت کو ناپسند فرمایا، ان کے سردار کو بُلایا اور ان سے پوچھا کہ آپ کو''ابوالحکم'' کیوں کہتے ہیں؟ اس نے جواب میں کہا کہ: میری قوم میں جب کوئی دو فریق اختلاف کریں تو وہ میرے پاس فیصلہ کرنے کے لیے آتے ہیں، پھر میں ان کے درمیان فیصلہ کرتا ہوں۔ تو دونوں فریق اس فیصلہ کو تسلیم کر لیتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا: آپ کی اولاد ہے؟ اس نے کہا: جی ہاں! میرے تین بیٹے ہیں: شریح، عبداللہ، مسلم۔ آپ نے اس سے پوچھا: ان میں بڑا کون ہے؟ انہوں نے کہا: شریح۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ: آپ ابوشریح ہیں نہ کہ ابوالحکم۔ کیونکہ اس میں تقدس اور بڑائی کا پہلو پایا جاتا ہے۔ (المدخل، ج:۱، ص:۱۱۰، فصل فی ذکر النعوت)

۵:-خود جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذاتِ اقدس کے متعلق ارشاد فرمایا: ''لَا تُطْرُوْنِيْ كَمَا أَطْرَتِ النَّصَارٰى عِيْسَى بْنَ مَرْيَمَ۔'' ....''لوگو! میری تعریف میں مبالغہ سے کام نہیں لینا، جیسا کہ نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے متعلق مبالغہ اختیار کیا ہے۔'' انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کوالوہیت کا درجہ دے کر خود کافر اور مشرک بن گئے، میرے ساتھ ایسا معاملہ نہ کرنا ''إِنِّيْ عَبْدُاللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ''...''میں تو اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔'' لہٰذا تم بھی مجھے اللہ کا بندہ اور رسول ہی کہو۔ (بخاری، باب ''و اذکر فی الکتاب مریم'')

ایک اعتراض اور اس کا جواب

یہاں پر یہ سوال ہوسکتا ہے کہ بعض مواقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مدح اور تعریف فرمائی ہے، اور ان کو اچھے اچھے القابات سے نوازا ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا: ''وَأَصْدَقُهُمْ حَيَاءً عُثْمَانُؓ'' حضرت علیؓ کے بارے میں فرمایا: ''وَأَقْضَاهُمْ عَلِيٌّ'' حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ اور بعض دیگر صحابہؓ کے بارے میں فرمایا: ''وَأَمِيْنُ أُمَّتِيْ أَبُوْعُبَيْدَةُ بْنُ الْجَرَّاحِ، وَأَعْلَمُ أُمَّتِيْ بِالْحَلَالِ مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍؓ، وَأَقْرَأُهُمْ أَبُوْ مُوْسٰى، نِعْمَ الْعَبْدُ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ وَ غَيْرُ ذٰلِكَ۔''

جواب:...اس سوال کا جواب امام نوویؒ، حافظ ابن حجرؒ، اور علامہ ابن بطالؒ نے یہ ذکر کیا ہے کہ صرف حقیقتِ حال بیان کرنے کی اجازت ہے کہ میرے علم کے مطابق فلاں آدمی میں یہ خوبی ہے، اس میں مبالغہ سے کام لینا جائز نہیں، جیسا کہ ''الْمَدَّاحِيْن'' (بہت زیادہ تعریف کرنے والے) کا لفظ بھی اس پر دلالت کرتا ہے۔ یہ بھی صرف اس شخص کے متعلق کہا جاسکتا ہے جس کے متعلق تکبر اور عجب کے فتنہ کا اندیشہ نہ ہو، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں یقین تھا کہ وہ حضرات اس سے فتنہ میں مبتلا نہیں ہوں گے؛ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تعریف فرمائی، چونکہ صحابہ کرامؓ کے علاوہ دیگر لوگوں کے متعلق فتنہ میں ابتلا کا اندیشہ غالب ہے، لہٰذا دوسرے لوگوں کی تعریف سے بچنا چاہیے۔ (شرح صحیح البخاری لابن البطالؒ: باب ما یکرہ من التمادح، ج:۹، ص:۲۵۳۔ فتح الباری: باب ما یکرہ من التمادح، ج:۱۰، ص:۴۷۶۔ شرح النووی علی صحیح مسلم، باب النہی عن المدح)

فقہائے کرام کے اقوال کی روشنی میں

قرآن وسنت کے ماہرین حضرات فقہائے کرام نے بھی نیکی، تقدس، پاکیزگی، بڑائی اور مدح سرائی میں مبالغہ کا تأثر دینے والے ان القاب کو ناجائز قرار دیا ہے۔

چنانچہ مالکیہ کے مشہور فقیہ علامہ ابن الحاج المالکی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اس بدعت سے بچنا ضروری ہے جو وبا کی طرح پھیل گیا ہے اور شاید ہی اس کی زد سے کوئی بڑا چھوٹا محفوظ رہا ہو، اور وہ یہ نئے اور

خودساختہ القابات ہیں جو شریعت کے سراسر مخالف ہیں، وہ ہیں: ''فلان الدین و فلان الدین'' عالم کے لیے تو اور زیادہ ضروری ہے کہ وہ اس جیسے القاب سے اپنے آپ کو محفوظ رکھے۔ اس سلسلے میں لوگوں کو بھی سمجھائیں کہ یہ القاب شریعت کے مخالف ہیں، لہٰذا ان کو اس جیسے القاب سے نہ پکاریں۔ ایسے القاب و اسماء کو استعمال کرنا جو تزکیہ اور تعریف پر مشتمل ہو، اس کی ممانعت کتاب اللہ، سنت رسول اور علماء کے اقوال سے ثابت ہوتی ہے۔ نیز یہ غلط بیانی اور جھوٹ میں داخل ہو کر سلفِ صالحین کے عمل کے بالکل مخالف ہے۔

آگے فرماتے ہیں کہ: اگر ان القاب و اسماء کا استعمال جائز ہوتا تو اُمتِ محمدیہ میں اس کے سب سے زیادہ حقدار اور مستحق صحابہ کرامؓ تھے، جو ہدایت کے سورج اور اندھیروں کے چراغ تھے، اور دین کے سب سے پہلے مددگار تھے، جیسا کہ قرآن نے اس کی گواہی دی ہے۔ اسی طرح ازواجِ مطہراتؓ جن کو اللہ تعالیٰ نے نبی پاک ﷺ کے لیے چنا اور جن کی فضیلت کی گواہی اللہ تعالیٰ نے خود دی ہے۔ ام المومنین حضرت زینب ؓ کا پہلے نام ''برہ'' تھا، آپ نے تبدیل کردیا، حالانکہ وہ اس کی مصداق اور حقدار تھیں، تو پھر ہم کون ہیں کہ اپنے لیے ایسے القاب تجویز کریں، لہٰذا نجات اور کامیابی صحابہؓ کی اتباع میں ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے امام نوویؒ کا مشہور اور معروف واقعہ بھی نقل کیا ہے۔

امام نوویؒ مشہور شافعی عالم دین ہیں جو کئی مفید اور بڑی کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں شرح مجموع مہذب، اور شرح مسلم جو کئی جلدوں پر مشتمل ہے اور ریاض الصالحین وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ شافعیہ میں بڑی عبقری شخصیت گزرے ہیں جن کی تصنیفات سے اُمت کا ایک بڑا طبقہ استفادہ کرتا چلا آرہا ہے، دینی و علمی خدمات کی بنیاد پر جب ان کے معاصرین نے ان کو محی الدین کے لقب سے موسوم کیا تو انہوں نے سخت ناراضگی کا اظہار کیا، اور فرمایا: ''إِنِّيْ لَا أَجْعَلُ أَحَداً فِيْ حِلٍّ مَنْ يُّسَمِّيْنِيْ بِمُحْيِ الدِّيْنِ۔'' یعنی میں کسی کو بھی محی الدین کے لقب سے پکارنے کی اجازت نہیں دیتا، حالانکہ وہ اس لقب کے حق دار بھی تھے، یہی وجہ ہے کہ امت نے انہیں انتقال کے بعد اس لقب سے موسوم کیا، مگر اپنی زندگی میں انہوں نے سخت ناراضگی کا اظہار کیا اور ظاہر ہے کہ ناراضگی کی وجہ صرف یہی تھی کہ اس میں مذہبی تقدس کا پہلو تھا۔ (المدخل، ج:۱، ص:۱۱۱، فصل فی النعوت)

مولانا عبدالحئی لکھنویؒ نے ''فوائدِ بہیہ'' کے آخر میں لکھا ہے کہ عراق کے فقہاء میں عام طور پر القاب میں سادگی تھی، وہ کاروبار، محلّہ، قبیلہ یا گاؤں کی طرف نسبت کرنے پر اکتفا کیا کرتے تھے، جیسے جصاص (گچ والا)، قدوری (ہانڈی والا)، طحاوی (طحا گاؤں کا باشندہ)، کرخی (مقام کرخ کا باشندہ)، صیمری (صیمرہ کا باشندہ)، اور خراسان اور ماوراء النہر میں عام طور پر القاب میں مبالغہ کیا جاتا تھا، اور دوسروں پر ترفع ظاہر کیا جاتا تھا، جیسے: شمس الائمہ، فخر الاسلام، صدر الاسلام، صدرِ جہاں، صدر

الشریعہ وغیرہ اور یہ صورت زمانۂ مابعد میں پیدا ہوگئی تھی۔ پہلے زمانے کے لوگ اس قسم کی باتوں سے پاک تھے۔ ابوعبداللہ قرطبیؒ اسماء اللہ الحسنیٰ کی شرح میں لکھتے ہیں کہ:

''قرآن وحدیث سے اپنا تزکیہ کرنے کی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا ہے کہ: مصر کے علاقوں میں اور دیگر بلادِ عرب وعجم میں جو رواج ہوگیا ہے کہ اپنے لیے ایسی صفات استعمال کی جاتی ہیں جو تزکیہ اور تعریف پر دلالت کرتی ہیں وہ بھی اس ممانعت میں داخل ہے، جیسے زکی الدین، محی الدین، علم الدین، اور اسی طرح کے دیگر القاب۔ اور محی الدین نحاس کی ''تنبیہ الغافلین'' میں جہاں منکرات کا تذکرہ ہے، لکھا گیا ہے کہ منکرات میں سے وہ بھی ہے جو وبا کی طرح پھیل گیا ہے، یعنی وہ جھوٹ جو زبانوں پر رائج ہوگیا ہے اور وہ خودساختہ القاب ہیں: جیسے محی الدین، نورالدین، عضدالدین، غیاث الدین، معین الدین، اور ناصرالدین وغیرہ۔ یہ وہ جھوٹ ہے جو پکارتے وقت اور تعریف کرتے وقت اور حکایت کرتے وقت زبانوں پر بار بار آتا ہے۔ یہ سب دین میں امر منکر اور بدعت ہے۔''

مذکورہ بالا اقتباسات نقل کرنے کے بعد مولانا لکھنویؒ نے یہ نوٹ لکھا ہے کہ:

''یہ بات یعنی مذکورہ بالا القاب کا منکر و بدعت ہونا اس صورت میں ہے جب کہ صاحبِ لقب اس کا اہل نہ ہو، یا اہل تو ہو مگر اس نے لقب بطور تزکیہ رکھا ہو۔''

(فوائد بہیہ: ۱۰۰، بحوالہ: آپ فتویٰ کیسے دیں؟: ۵۰)

حاشیہ میں حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری صاحب لکھتے ہیں:

''ہمارے عرف میں یہ القاب بطور اعلام (ناموں کے) مستعمل ہیں، اس لیے ممنوع نہیں ہیں، ہمارے محاورات میں القابِ غالیہ کی مثالیں، مفتی اعظم، محقق بے بدل، خطیبِ عصر، علامۂ زماں وغیرہ ہیں۔'' (آپ فتویٰ کیسے دیں؟: ۵۰)

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک سلسلۂ گفتگو میں بعض مخترع القاب کے متعلق فرمایا:

''خبر نہیں لوگ کس عبث اور فضولیات میں مبتلا ہیں، اس سے ان لوگوں کے مذاق کا پتہ چلتا ہے، کوئی شیخ الحدیث ہے، کوئی استاذ الحدیث، کوئی شیخ التفسیر، کوئی شیخ الجامعہ، یہ اس قسم کے جھگڑے ابھی شروع ہوئے ہیں۔ ہمارے بزرگوں میں تو ان چیزوں کا نام ونشان بھی نہ تھا، یہ سب جاہ طلبی ہے۔ اور سب سے زیادہ اچھی اور خوبی کی بات تو وہی ہے جو پہلے اپنے بزرگوں میں تھی: سادگی، اسی میں برکت ہے، ان چیزوں میں برکت کہاں، یہ سب نئی روشنی کا اثر ہے۔'' (ملفوظ نمبر: ۴۲۷، ۳/ ۲۷، ملفوظات حکیم الامت)

آپ کو صرف مولانا محمد انور شاہ لکھنے کی اجازت ہے

حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ علم وفضل میں یکتائے روزگار تھے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اپنی ایک مجلس میں نقل کیا کہ ایک عیسائی فیلسوف نے لکھا ہے کہ: ’’اسلام کی حقانیت کی ایک دلیل یہ ہے کہ امام غزالیؒ جیسا محقق اور مدقق اسلام کو حق سمجھتا ہے۔‘‘ یہ واقعہ بیان کرکے حضرت تھانویؒ نے فرمایا: ’’میں کہتا ہوں کہ میرے زمانے میں مولانا انور شاہ صاحبؒ کا وجود اسلام کی حقانیت کی دلیل ہے کہ ایسا محقق اور مدقق عالم اسلام کو حق سمجھتا ہے اور اس پر ایمان رکھتا ہے۔‘‘

حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ فرماتے ہیں کہ: طلاق کے ایک مسئلہ میں کشمیر کے علماء میں اختلاف ہوگیا، فریقین نے حضرت شاہ صاحبؒ کو حکم بنایا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے دونوں کے دلائل غور سے سنے، ان میں سے ایک فریق اپنے موقف پر فتاویٰ عمادیہ کی ایک عبارت سے استدلال کررہا تھا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا: میں نے دارالعلوم کے کتب خانے میں فتاویٰ عمادیہ کے ایک صحیح قلمی نسخے کا مطالعہ کیا ہے، اس میں یہ عبارت ہرگز نہیں ہے، لہٰذا یا تو ان کا نسخہ غلط ہے یا یہ لوگ کوئی مغالطہ انگیزی کررہے ہیں۔ ایسے علم وفضل اور ایسے حافظہ کا شخص اگر بلند و بانگ دعوے کرنے لگے تو کسی درجہ میں اس کو حق پہنچ سکتا ہے، لیکن حضرت شاہ صاحبؒ اس قافلۂ رشد و ہدایت کے فرد تھے جس نے ’’مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ‘‘ کا عملی پیکر بن کر دکھایا تھا، چنانچہ اسی واقعہ میں انہوں نے حضرت علامہ محمد یوسف بنوریؒ کو اپنا فیصلہ لکھنے کا حکم دیا تو انہوں نے حضرت شاہ صاحبؒ کے نام کے ساتھ ’’الحبر البحر‘‘ (عالم متبحر) کے دو تعظیمی لفظ لکھ دیئے، حضرت شاہ صاحبؒ نے دیکھا تو قلم ہاتھ سے لے کر زبردستی خود یہ الفاظ مٹائے، اور غصہ کے لہجے میں مولانا بنوریؒ سے فرمایا: ’’آپ کو صرف مولانا محمد انور شاہ لکھنے کی اجازت ہے۔‘‘ حضرتؒ کا جملہ ملاحظہ فرمایئے کہ وہ تواضع کے کس مقام کی غمازی کررہا ہے؟ اور یہ محض لفظ ہی نہیں ہیں، بلکہ وہ واقعۃً اپنے تمام کمالات کے باوجود اپنے آپ کو ایک معمولی طالب علم سمجھتے تھے اور اس دعائے نبوی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے مظہر تھے: ’’اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِيْ فِيْ عَیْنِيْ صَغِیْرًا وَ فِيْ أَعْیُنِ النَّاسِ کَبِیْرًا۔‘‘ (اکابر دیوبند کیا تھے؟:۹۷، ۹۸)

حقیقت یہ ہے کہ علم وفضل کے سمندر سینے میں جذب کرلینے کے باوجود سلفِ صالحین کی تواضع، سادگی، اور للّٰہیت انتہاء کو پہنچی ہوئی تھی۔

تحدیث بالنعمۃ کی اجازت

اگر اللہ تعالیٰ نے کسی کو اچھے اعمال، اچھے اخلاق، اور اچھے اوصاف کی نعمت سے نوازا ہو اور وہ بطور تحدیث بالنعمۃ اپنی اچھی حالت بیان کردے تو اس کی گنجائش ہے۔ لیکن بیان کرتے وقت اپنے باطن کا جائزہ لے لے کہ نفس کہیں دھوکہ تو نہیں دے رہا ہے۔ (المستفاد: انوارالبیان، ج:۱، ص:۶۰۱۔ معارف القرآن، ج:۲، ص:۴۳۱)

ایسا لقب اختیار کرنا جس سے گناہ گاری ٹپکتی ہو

یاد رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح ام المومنین کا نام زینب رکھ دیا جن کا پہلا نام ''برہ'' تھا، اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لڑکی کا نام ''جمیلہ'' رکھ دیا جس کا پہلا نام ''عاصیہ'' (گناہ گار) تھا۔ (رواہ مسلم) معلوم ہوا کہ اپنی نیکی کا ڈھنڈورا بھی نہ پیٹے، اور اپنا نام اور لقب بھی ایسا نہ رکھے جس سے گناہ گاری ٹپکتی ہو، مومن نیک ہوتا ہے، لیکن نیکی کو بگھارتا نہیں پھرتا، اور کبھی گناہ ہو جاتا ہے تو توبہ کر لیتا ہے۔ نیز اپنی ذات کے لیے کوئی ایسا نام و لقب بھی تجویز نہیں کرتا، جو گناہ گاری کی طرف منسوب ہوتا ہو، بہت سے لوگ تواضع میں اپنے نام کے ساتھ العبد العاصی یا عاصی پر معاصی لکھتے ہیں، یہ طریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جوڑ نہیں کھاتا۔ (انوار البیان، ج:۵،ص:۲۳۲)

ضرورت اس امر کی ہے کہ عوام کے سامنے یہ بات خوب واضح کر لی جائے، اس طرح بے محل القاب استعمال کرنا ہرگز درست نہیں، بلکہ یہ غلط بیانی اور جھوٹ میں داخل ہے۔ نیز مدارسِ دینیہ میں طلبہ کرام کی اس طرح تربیت کی جائے کہ وہ اپنے لیے ایسے القاب پسند ہی نہ کریں، بلکہ سادگی کے ساتھ اپنے نام کو ہی پسند کریں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سلسلے میں افراط و تفریط سے بچنے اور راہِ اعتدال پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

مدرسہ کا آغاز وارتقاء...جامعہ علومِ اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

کا تعلیمی منہج اور کردار.....ایک تحقیقی مطالعہ

ڈاکٹر مولانا انعام اللہ
چیف ریسرچ آفیسر اسلامی نظریاتی کونسل، اسلام آباد

(تیسری اور آخری قسط)

جامعہ کا نظامِ تعلیم وتربیت

جامعہ کے نظامِ تعلیم وتربیت کے اہم نکات حسب ذیل ہیں:

تعلیمی سال کا دورانیہ

تعلیمی سال کا دورانیہ شوال المکرّم تا شعبان المعظم ہوتا ہے، چھ شوال سے جامعہ کے دفتر کھل جاتے ہیں، اور داخلے کی سرگرمیاں شروع ہو جاتی ہیں، دس شعبان سے پہلے تک سالانہ امتحانات کا انعقاد مکمل ہو جاتا ہے، تقریباً دو مہینے سالانہ تعطیل ہوتی ہے، تاہم اس عرصے میں درجہ حفظ کی پڑھائی اور ہم نصابی سرگرمیاں جاری رہتی ہیں۔عیدالاضحیٰ کے موقع پر تقریباً دس دن چھٹی ہوتی ہے، جبکہ عیدالفطر کے تقریباً دس ایام جامعہ کے اکثر دفاتر بندر ہتے ہیں۔ ہفتہ وار تعطیل جمعۃ المبارک کو ہوتی ہے۔

نظامِ داخلہ

جامعہ کے شعبہ حفظ وناظرہ اور درسِ نظامی مع تخصصات میں صرف شوال کے مہینے میں داخلے ہوتے ہیں، داخلے کے وقت تعلیمی قابلیت کے علاوہ کردار کے حوالے سے خوب جانچ پڑتال ہوتی ہے۔ نیز ذہنی وفکری رجحان کا بھی جائزہ لیا جاتا ہے، تاکہ جامعہ میں طلباء کی کثرت کی وجہ سے عملاً تمام درجات میں یا تو داخلہ نہیں دیا جاتا یا محدود داخلہ دیا جاتا ہے۔رہائشی طلباء کے لیے قیام وطعام اور درسی کتابوں اور علاج معالجے جیسے تمام سہولیات کا انتظام ہوتا ہے۔دارالاقامہ میں چوبیس گھنٹے کی نگرانی کا نظام ہوتا ہے۔اخلاقی تربیت کا بھی خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے۔

اوقات ونظامِ تعلیم

نمازِ فجر کے ساتھ ہی طلباء کی تعلیمی سرگرمیوں کا آغاز ہوجاتا ہے۔ نماز کے بعد طلباء اختیاری طور پر تلاوتِ قرآن مجیداوراورادِ مسنونہ کا اہتمام کرتے ہیں۔ ناشتہ ودیگر ضروریات کے بعد باقاعدہ تعلیم کا آغاز ہوجاتا ہے۔ ۵۰ منٹ کے دورانیہ پر مشتمل پانچ گھنٹے صبح کے اوقات میں اور ۶۰ منٹ کے دورانیہ پر مشتمل دو گھنٹے ظہر کے بعد ہوتے ہیں۔ درمیان میں کھانے، قیلولہ اور نماز کے لیے وقفہ ہوتا ہے۔ گرمی کے موسم میں نمازِ عصر کے بعد شام کے کھانے کا وقت ہوتا ہے، جبکہ سردیوں میں عشاء کے بعد۔ عصر تا مغرب کھیل، تفریح اور دیگر معمولات کے لیے طلباء کو فارغ کردیا جاتا ہے۔ مغرب تا رات ۱۱ بجے تکرار ومطالعہ کا وقت ہوتا ہے، درمیان میں نماز عشاء کے لیے وقفہ ہوتا ہے۔ ۱۱ بجے سے سونے کا وقت شروع ہوجاتا ہے۔

طریقۂ تعلیم

جامعہ میں ذریعۂ تعلیم اردو ہے، جبکہ صفوفِ عربیہ میں ذریعۂ تعلیم عربی ہے۔ ابتدائی کتابوں میں اسباق کو زبانی یادکرانے پر زور دیا جاتا ہے اور درمیانی درجات میں کتاب کی عبارت حل کرنے اور تفہیم پر زور دیا جاتا ہے۔ عموماً طالب علم عربی عبارت پڑھتا ہے، استاذ ترجمہ اور تشریح کرتا ہے۔ عبارت خوانی پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ روزانہ یا ہفتہ وار سبق سنانے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

امتحانات کا نظام

سال میں تین امتحانات کا انعقاد کیا جاتا ہے: سہ ماہی، شش ماہی اور سالانہ۔ اکثر درجات میں سالانہ امتحان وفاق المدارس العربیہ کے تحت منعقد ہوتا ہے، کامیابی کے لیے ۴۰ نمبر حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اول، دوم، سوم پوزیشن حاصل کرنے والے نیز ۹۰ فیصد سے زیادہ نمبر حاصل کرنے والے طلباء کو انعامات اور تعریفی وتحسینی اسناد دیئے جاتے ہیں، جبکہ ناکام ہونے والے طلباء پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ تمام دینی مدارس کی طرح جامعہ میں امتحانات ہمیشہ بروقت منعقد ہوتے ہیں، جو ایک انتہائی مثبت پہلو ہے۔

وفاق المدارس العربیہ

جامعہ کے قیام کے اغراض ومقاصد میں دوسری جامعات، مدارس اور علمی اداروں کے ساتھ روابط پیدا کرنا بھی شامل ہے۔ حضرت بنوریؒ کی اسی سوچ کا مظہر وفاق المدارس کا قیام ہے۔ معاصر علماء کرام کی باہمی مشاورت وتعاون سے اس ادارے کی بنیاد رکھی گئی، جس کا بنیادی مقصد مدارسِ دینیہ کے لیے یکساں نظامِ امتحانات کا انعقاد ہے، جس میں یہ ادارہ مکمل طور پر کامیاب ہوا ہے۔ تأسیس سے

لے کر آج تک جامعہ اس ادارے میں مؤثر نمائندگی رکھتا ہے۔ وفاق المدارس کے نظامِ امتحانات، پیپرز کی تیاری، تقسیم وترسیل وغیرہ تمام مراحل کو عملی شکل دینے کی بنیاد جامعہ کے ناظم تعلیمات واستاذ الحدیث مولانا ادریس میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ نے رکھی، بعد ازاں ہر دور میں وفاق کے اہم عہدوں میں سے کوئی نہ کوئی عہدہ جامعہ کے پاس رہا۔ اس وقت بھی وفاق المدارس کی صدارت جناب مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر دامت برکاتہم کے سپرد ہے۔ وفاق کے امتحانات میں ہمیشہ جامعہ کے طلباء کی کارکردگی نمایاں وقابلِ ذکر ہوتی ہے۔

ہم نصابی سرگرمیاں

معاشرے میں مؤثر کردار ادا کرنے کے لیے کئی پہلوؤں سے طلباء کی صلاحیتوں اور استعدادات کونکھارنے کے لیے متعدد ہم نصابی سرگرمیوں کا انعقاد جاری رہتا ہے، جن میں اردو وعربی زبان میں خطابت، عربی زبان میں تکلم، خوش نویسی، طلباء کے درمیان مسابقت کا جذبہ بیدار رکھنے کے لیے صرف ونحو میں مقابلے، سالانہ تعطیلات میں مختصر کورسز، دورہ تدریبیہ وغیرہ کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ دورۂ تدریبیہ میں من جملہ دیگر امور کے کامیاب استاذ بننے اور تدریس کے قدیم وجدید طریقوں کے استعمال کی تربیت دی جاتی ہے۔

تعلیمی وانتظامی نظام کا ڈھانچہ

اہتمام: یونیورسٹیز کے وائس چانسلر جیسا منصب ہے، ادارے کا پورا نظام اس منصب کی ماتحتی میں چلتا ہے۔ **نائب مہتمم:** مہتمم کی نیابت کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ **نظامتِ تعلیمات:** تمام تعلیمی امور کی ذمہ داری اس منصب کے سپرد ہوتی ہے، جو دفترِ اہتمام کی ہدایات ومنظوری سے تعلیمی امور کی تنظیم وتنسیق کرتا ہے۔ **نظامتِ دارالاقامہ:** دارالاقامہ (ہاسٹل) کی نگرانی اور طلباء کے نظام الاوقات پر عملدرآمد کرانا اس منصب کی ذمہ داریوں میں شامل ہے، جامعہ میں متعدد دارالاقامہ (ہاسٹلز) ہیں، جامعہ کے مدرسین نظام کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ **مجلسِ تعلیمی:** یہ مجلس (لجنۃ) تقریباً تمام مدارس میں ہوتی ہے، جامعہ میں آغاز ہی سے یہ مجلس قائم ہے۔ مہتمم، نائب مہتمم اور ناظم تعلیمات بلحاظِ عہدہ اس مجلس کے اراکین ہوتے ہیں، جبکہ بزرگ وسینئر اساتذہ کرام بھی اس مجلس کے اراکین ہوتے ہیں۔ مجلس، تعلیمی امور وامتحانات کی تنظیم وتنسیق اور نگرانی کرتی ہے۔ **مجلسِ شوریٰ:** جامعہ میں شورائی نظام ہے، اس لیے مجلسِ شوریٰ کے نام سے یہ کمیٹی ہے، جس میں بنیادی نوعیت کے فیصلے ہوتے ہیں، اور دفترِ اہتمام کی منظوری کے بعد نافذ العمل ہو جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہر شعبے کا ایک نگران ہوتا ہے، جو اپنے شعبے کا مسئول ہوتا ہے۔ گیارہ فروع (شاخوں) کے بھی نگران مقرر ہیں، جو متعلقہ شاخ کے تمام امور کی نگرانی ومسئولیت کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔

شعبہ مالیات

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد کے ساتھ جب اوقاف اور مقررہ وظائف کا صدیوں پرانا نظام معطل کردیا گیا، تو مدارس کی نشأۃِ ثانیہ کے وقت مسلمان معاشرے نے مدارس ومساجد کے نظام کو اپنی مدد آپ کے اصول کے تحت چلانا شروع کیا اور آج تک یہ سلسلہ قائم ہے۔ جامعہ کی مالیات کا نظام بھی اسی اصول پر قائم ہے۔ مسلمان عوام کی مدد سے جامعہ کی ضروریات پوری کی جاتی ہیں۔ برملا یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ جامعہ کسی بھی حکومتی امداد، خواہ اپنی ملکی حکومت ہو یا بیرونِ ممالک کی حکومتیں ہوں، قبول کرنے کا روادار نہیں۔ شرعی لحاظ سے مسلمانوں کے اموال کی نوعیتیں اور مدات مختلف ہیں، ہر نوع اور ہر مد کے مال کے جداگانہ احکام ہیں، اس لیے اموال قبول کرنے اور مصارف میں خرچ کرنے میں مکمل شرعی احکام کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ اس احتیاط کی بدولت مسلمانوں کو مکمل اعتماد ہے کہ ہمارے اموال دیانت دار ہاتھوں میں بالکل صحیح مصارف پر خرچ ہورہے ہیں، اس لیے وہ اپنے اس اسلامی فریضہ کی ادائیگی میں کسی طرح بخل اور امساک سے کام نہیں لیتے۔ حضرت بنوری رحمہ اللہ نے مالیات کا جو نظام قائم کیا تھا، اس میں استغناء، احتیاط اور شرعی احکام کا مکمل لحاظ جیسے اُصول کارفرما ہیں، اس لیے جامعہ نے کبھی بھی چندہ مانگنے اور اموال وصول کرنے کے لیے نمائندہ مقرر نہیں کیا۔ اہلِ خیر حضرات بنفس نفیس دفترِ حسابات میں رقم جمع کرتے ہیں۔ جامعہ کی طرف سے بعض مواقع، جیسے چرمہائے قربانی جمع کرنے اور صدقۂ فطر وصول کرنے میں دینے والوں کی سہولت کا خیال رکھا جاتا ہے۔ مالیاتی نظام کے حوالے سے آغاز میں حضرت بنوریؒ کو بڑی صبر آزما اور کٹھن صورت حال کا سامنا کرنا پڑا، مشقتیں برداشت کیں، لیکن وضع کردہ اصولوں سے سرموانحراف نہیں کیا، اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمان عوام کا اعتماد بن گیا، اور جامعہ کی تمام ضروریات آسانی سے پوری ہوجاتی ہیں۔ سالانہ کی بنیاد پر منظور کردہ اداروں اور افراد سے آڈٹ کرایا جاتا ہے اور ملکی قانون کی مکمل پاسداری کی جاتی ہے۔

تیسری بحث

اسلامی معاشرے کی تشکیل اور اسلامی شناخت کی بقاء میں جامعہ کا کردار اور اثرات

جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی نے اب تک اسلامی معاشرے کی تشکیل، اسلامی اقدار اور اسلامی ثقافت کے تحفظ میں کیا کردار ادا کیا؟! اور بانیِ جامعہ کے بیان کردہ قیام کے اغراض ومقاصد کس حد تک حاصل ہوئے ہیں؟! اس بحث میں اختصار کے ساتھ اس کا جائزہ لیا جائے

گا۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ اسلامی معاشرے کی تشکیل، بقاء اور اسلامی شناخت کو برقرار رکھنے میں تمام مدارسِ دینیہ کا اہم کردار ہے۔ برصغیر بلکہ مسلمانانِ عالم پر دینی مدارس اور ان کے بانیان وعلماء کرام کا بہت بڑا احسان ہے کہ انہوں نے دینی مدارس کے ذریعے علومِ نبوت کی حفاظت کی، اور ایسے علماء حق پیدا کیے جنہوں نے اُمت کی دینی، ایمانی اور اخلاقی تربیت فرمائی، اس کی برکت سے آج شعائرِ اسلام زندہ ہیں، معروف ومنکر کا فرق واضح ہے اور دلوں میں ایمان کی حرارت باقی ہے۔ ان اثرات میں جامعۃ العلوم الاسلامیہ کا وافر حصہ ہے۔ بانیِ جامعہ کی عالمگیر شخصیت کی بدولت جامعہ کے مثبت اثرات پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں، جہاں بھی بنی نوع انسان آباد ہیں، بلاواسطہ یا بالواسطہ جامعہ کے دینی اثرات وہاں تک پہنچے ہوئے ہیں۔ آسانی کے لیے اس بحث کو ہم دو عنوانات: ۱:- دینی وعلمی خدمات، ۲:- رفاہی خدمات: کے تحت سمیٹنے کی کوشش کریں گے۔ **دینی وعلمی خدمات:** مدارس کے قیام کا اصل مقصد علومِ نبوت کی حفاظت، اشاعت اور تبلیغ ہے، اس کے لیے رجالِ کار کی ضرورت ہوتی ہے۔ جامعہ کے قیام کا بھی یہی مقصد تھا، بلکہ جامعہ کی تمام دینی وعلمی خدمات کا نقطۂ آغاز ایسے رجالِ کار کی تیاری ہے، جو ہر قسم کی دینی خدمات سرانجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ جامعہ نے جو رجالِ کار تیار کیے، وہ مختلف حیثیتوں سے دینی خدمات سرانجام دے رہے ہیں، جس کی قدرے تفصیل حسب ذیل ہے:

دینی علوم کے ماہر مدرسین

جامعہ نے ہزاروں کی تعداد میں ایسے ماہر علماء اور اساتذہ پیدا کیے، جو دینی مدارس میں دینی علوم کی تدریسی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ جامعہ کے تمام مدرسین، جن کی تعداد سینکڑوں میں ہے، تقریباً جامعہ ہی کے فارغ التحصیل ہیں، ملک بھر اور دنیا بھر میں مسندِ حدیث پر فائز شیوخ الحدیث واساتذۂ حدیث، مسندِ تفسیر پر فائز شیوخ التفسیر اور تمام علوم وفنون کے مدرس کی حیثیت سے جامعہ کے سینکڑوں فضلاء دینی خدمات سرانجام دے رہے، اور مسلمان معاشرے کی اس اہم دینی ضرورت کو پورا کر رہے ہیں۔

اذان اور امامت وخطابت

مسجد مسلمان معاشرے کی پہچان اور وجود کا مرکزی نقطہ ہے اور مسجد میں امامت وخطابت کا منصب مسجد کی روحانی تعمیر کا مرکزی نقطہ ہے۔ دنیا بھر کی ہزاروں مساجد میں جامعہ کے فضلاء بحسن وخوبی ایک ایسا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں، جو اسلامی معاشرے کی بنیادی ضرورت ہے اور عہدِ رسالت میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم نے ہمیشہ اس منصب کو بذاتِ خود سنبھالا۔ ملکِ عزیز کے اندر اور پوری دنیا کے ممالک میں ہزاروں کی تعداد میں جامعہ کے فضلاء اذان، امامت کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔

مدارس و مکاتب کا قیام

اسلامی معاشرے اور مسلمان کمیونٹی کی معاشرتی ضرورت ہے کہ دینی مدارس اور حفظ و ناظرہ کے مکاتب کے قیام کا سلسلہ جاری رہے، ان علاقوں میں اس کی ضرورت اور بھی بڑھ جاتی ہے جو پسماندہ ہوں اور جہاں دینی تعلیم کا مؤثر انتظام نہ ہو، اور ان ممالک میں تو ضرورت کی حد سے بھی آگے بڑھ جاتی ہے جہاں مسلمان تعداد کے لحاظ سے کم ہوں اور غیر مسلم اکثریت میں ہوں۔ جامعہ نے اس ضرورت کو پورا کرنے میں کس طرح اپنا حصہ ڈالا؟! اس کی متعدد مثالیں ہیں، تاہم یہاں چند مثالوں پر اکتفاء کیا جاتا ہے جس سے راقم بذاتِ خود واقف ہے، ملاحظہ ہوں:۔

پسماندہ علاقوں میں تعلیم کی ترویج، جامعہ اسلامیہ بابوزئی کا قیام

ضلع مردان کے شمال مشرق میں واقع بابوزئی بستی، جو راقم کا آبائی گاؤں ہے، ایک پسماندہ علاقہ ہے تینوں اطراف سے بلند و بالا پہاڑوں میں گھرا ہوا ہے، اس پسماندہ دور افتادہ علاقے میں جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے ناظمِ تعلیمات برادرم مولانا امداد اللہ صاحب کی فعال شخصیت نے علمی ماحول بنا دیا ہے، اس وقت تمام شعبوں میں پڑھنے والے بچوں بچیوں کی تعداد سولہ سو (۱۶۰۰) سے متجاوز ہے، جس میں علاقے کے طلبہ کے ساتھ پورے خیبر پختونخواہ کے طلبہ شامل ہیں۔ تدریسی وغیر تدریسی عملہ کی کل تعداد ۱۵۰ ہے۔(۱) حفظ کے بچوں کے لیے ''الجامعۃ الاسلامیہ ایجوکیشن سسٹم'' کے نام سے میٹرک تک کا سکول بھی مردان بورڈ سے (رجسٹرڈ) ہے۔ بچے حفظ کے ساتھ ساتھ میٹرک تک سکول کی تعلیم بھی حاصل کر لیتے ہیں، گویا جامعہ اسلامیہ علاقے میں دینی وعصری تعلیم کی ترویج واشاعت میں اپنا بھاری بھر کم وزن ڈال رہا ہے۔ اس چشمۂ صافی کے سوتے جامعہ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن سے پھوٹتے ہیں۔ اس کے علاوہ صرف ضلع مردان کی سطح پر جامعہ کے فضلاء کے قائم کردہ تقریباً دس تعلیمی ادارے ضلع کے بچے اور بچیوں کو دینی تعلیم کے زیور سے آراستہ کر رہے ہیں، جن میں ہزاروں بچے بچیاں دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔(۲)

اس کے علاوہ متعدد ممالک بالخصوص غیر مسلم ممالک میں جامعہ کے فضلاء نے جامعہ کے طرز پر دینی ادارے قائم کر رکھے ہیں، جو صرف دینی تعلیم نہیں، بلکہ دیگر دینی اُمور میں بھی مسلمانوں کی رہنمائی کا فعال نظام قائم کیے ہوئے ہیں، جن میں افریقی ممالک میں جامعہ اسلامیہ زامبیا،(۳) دار العلوم زکریا ساؤتھ افریقہ وغیرہ سرفہرست ہیں۔ یہ ادارے مساجد کا قیام، حلال اتھارٹیز اور ادارہ برائے تقسیم زکوٰۃ اور تبلیغی سرگرمیوں جیسے شعبے قائم کیے ہوئے ہیں۔ یہ تمام ادارے جامعۃ العلوم الاسلامیۃ علامہ بنوری ٹاؤن کے فضلاء چلا رہے ہیں، یہ فضلاء جامعہ کے اس احسان کو نہیں بھولے، اساتذہ کرام کے ساتھ

مسلسل رابطے میں رہتے ہیں، اس لیے ان سے مشورے لیتے ہیں اور ان کی راہنمائی میں آگے بڑھتے ہیں۔ گویا افریقی ممالک میں مسلم کمیونٹی کی اسلامی شناخت برقرار رکھنے اور مسلمانوں کی دینی ضروریات پورا کرنے کے حوالے سے جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی کا نمایاں اور مؤثر کردار ہے۔

تصنیفی وتالیفی خدمات

اسلامی معاشرے کی تشکیل میں تصنیف وتالیف کی اہمیت مخفی نہیں۔ بانیِ جامعہ کی تصنیفی خدمات کا تذکرہ شروع میں گزر گیا۔ دار التصنیف کے تعارف کے تحت جامعہ کے فضلاء اور اساتذہ کی معرکۃ الآراء تصنیفات کا بھی ذکر کیا گیا۔ جامعہ کے اساتذہ کرام کی سینکڑوں تصنیفی خدمات ہیں۔ ڈاکٹر مولانا عبدالرزاق سکندر دامت برکاتہم العالیہ کی کتاب ''**الطريقة العصرية**'' وفاق المدارس کے نصاب میں شامل ہے جس کے ذریعے لاکھوں کی تعداد میں بنین اور بنات عربی زبان سیکھتے ہیں۔ مولانا محمد انور بدخشانی کی اب تک کے قریب وقیع علمی کتب عربی، فارسی اور اُردو زبان میں منصۂ شہود پر آچکی ہیں۔ آپ کا فارسی ترجمۂ قرآن مدینہ منورہ میں قائم ''**مجمع الملك فهد لطباعة القرآن الكريم**'' نے فارسی زبان میں لکھے گئے تمام تراجم میں سے منتخب کر کے شائع کیا، اور سعودی حکومت کی طرف سے ان ممالک میں مفت تقسیم ہورہا ہے، جن میں فارسی بولی جاتی ہے۔ یہ پاکستان، دینی مدارس، بالخصوص جامعہ کے لیے بڑے فخر کی بات ہے۔ آپ کی ایک تالیف ''**تيسير أصول الفقه**'' کو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے ریفرنس بکس کی فہرست نصاب میں شامل کیا گیا ہے۔ (۴) مولانا حبیب اللہ مختار صاحب شہید رحمہ اللہ کی تصنیفات وتراجم وفاق المدارس بنات کے نصاب میں شامل ہیں، صرف ونحو میں اساتذۂ جامعہ کی مشترکہ تصنیفات شامل ہیں۔ جامعہ کے دیگر فضلاء جو اپنے اپنے مقامات پر خدمتِ دین کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں، سینکڑوں کی تعداد میں کتابیں لکھ چکے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔

صحافت کے ذریعے اسلامی معاشرے کی تشکیل

نظریات اور تعلیمات کی نشر واشاعت کے لیے ایک اہم شعبہ صحافت کا ہے، آپ کے مسائل اور ان کا حل کے عنوان سے جاری جنگ اخبار کا جمعہ ایڈیشن جامعہ ہی کے اکابر کے قلم سے نکلنے والے دینی مسائل کا مجموعہ ہوتا ہے، جس کو پوری دنیا میں پڑھا جاتا ہے۔ پہلے مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمہ اللہ عوامی سوالات کے جوابات لکھتے تھے، ان کے بعد حضرت مفتی نظام الدین شامزی رحمہ اللہ، پھر حضرت مولانا سعید احمد جلالپوری شہید رحمہ اللہ اور آج کل جامعہ کے مہتمم ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر مدظلہ العالی یہ جوابات تحریر فرماتے ہیں۔ مولانا لدھیانوی رحمہ اللہ کے لکھے گئے جوابات کو جنگ اخبار ہی نے کتابی شکل میں ۱۰ جلدوں میں چھاپ دیا ہے، بقیہ مسائل بھی کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے

علاوہ بھی جامعہ کے فضلاء صحافت کے میدان میں سرگرمِ عمل ہیں۔

سرکاری ملازمتیں

جامعہ کے فضلاء اور منتسبین کی بہت بڑی تعداد سرکاری مناصب پر فائز ہیں، بالخصوص مذہبی علوم سے متعلق مناصب۔ اسکولز کے اساتذہ، کالج کے لیکچررز، یونیورسٹیوں کے ڈاکٹرز و پروفیسرز، آرمی، بحریہ، ایئرفورس کے ائمہ وآفیسرز میں جامعہ کے فضلاء کی بڑی تعداد شامل ہے، ٹیکنیکل پوسٹوں پر بھی فائز لوگوں میں جامعہ کے فضلاء موجود ہیں، تجارت پیشہ افراد میں جامعہ کے فضلاء کے نمایاں نام ہیں۔ مروجہ اسلامی بینکاری کے حوالے سے جامعہ کے دارالافتاء کا مؤقف چونکہ مانعین کی فہرست میں شامل ہے۔ وہ اسلام کی طرف منسوب حالیہ بینکوں کو روایتی بینکوں کا تسلسل اور تشکیلِ نو قرار دیتے ہیں، اس لیے جامعہ نے اس حوالے سے فضلاء کی حوصلہ افزائی نہیں کی کہ وہ اسلامی بینکوں میں جاکر خدمات سرانجام دیں، اس کا اثر یہ ہے کہ جامعہ کے فضلاء اس میدان کی طرف رُخ نہیں کرتے۔ یہ طرزِ عمل ایک مثبت رویہ کی نشاندہی کرتا ہے کہ فضلاء جامعہ اپنے اساتذہ اور جامعہ کے مؤقف کا احترام کرتے ہیں اور ان کی آراء، اقوال اور نصائح کی روشنی میں میدانِ عمل منتخب کرتے ہیں، تاہم چند ایک ایسے فضلاء جامعہ بھی ہیں جنہوں نے تخصص جامعہ کے علاوہ کسی اور ادارے سے کیا اور وہ اسلامی بینکوں میں پالیسی ساز مناصب پر فائز ہیں۔

جدید خیالات وانحرافی نظریات کا تعاقب

اسلامی معاشرے کے توڑ کے لیے اسلام دشمن عناصر کے ہاتھ میں سب سے مؤثر ہتھیار یہ ہوتا ہے کہ ایسے افکار اور خیالات کی تشہیر کی جائے جو اُمت کی اجتماعی سوچ اور فکر کے خلاف ہوں، اس کو فتنہ سے تعبیر کیا جائے، جیسا کہ علماء اور اہل مدارس کا مؤقف ہے یا کوئی اور نام دیا جائے، بہرحال! اس میں شک نہیں کہ چودہویں اور پندرہویں صدی ہجری میں نصوص اور اسلامی تعلیمات کی ایسی تشریح وتعبیر کا سلسلہ شروع ہوگیا، تراث میں جس کی نظیر نہیں، یا اگر ہے تو ان فرقوں کے عقائد اور خیالات ونظریات ہیں جن کو امت کی اجتماعی سوچ نے مسترد کیا ہے، اور اسی لیے وہ فرقے اور ان کے خیالات اپنی موت آپ مر گئے ہیں، ایسی جدید اور انوکھی تعبیرات، خیالات اور سوچ اس لائق ہیں کہ اس کو مسترد کیا جائے، لیکن ایسے خیالات اور تعبیرات میں عموماً ایک تو ایسا اجمال وابہام ہوتا ہے جس کو عوام الناس تو کجا، اچھے خاصے پڑھے لکھے اور بعض علماء بھی نہیں سمجھ پاتے یا ان کو ایسی خوش کن اور پررونق تعبیر میں لپیٹ کر پیش کیا جاتا ہے اور اس کے تناظر میں ایسے سبز باغ دکھائے جاتے ہیں کہ اچھے خاصے اہلِ علم بھی غلط فہمی یا خوش فہمی کا شکار ہوکر اس کے پیچھے ہو پڑتے ہیں، گو بعد میں ان کے سامنے اصل چہرہ آجاتا ہے اور جمہور کے موقف کی طرف واپسی اختیار کر جاتے ہیں۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ہمیشہ سے جدید

خیالات کے پیچھے حکومتی طاقت، ذرائع اور سرپرستی حاصل ہوتی ہے، یا پھر اس فکر کے حامل لوگ سرمائے اور وسائل کی طاقت سے مالا مال ہوتے ہیں۔ جدید خیالات میں غلطی کی نشاندہی کرنے کے لیے عمیق علم کے ساتھ تقویٰ اور للّٰہیت کے اوصاف کا ہونا ضروری ہے، نیز صاحبِ عزیمت لوگ ہی یہ بوجھ اور ذمہ داری اُٹھا لیتے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں بالعموم اور ملکِ عزیز پاکستان میں بالخصوص یہ کاروبار آغاز کار سے جاری وساری ہے۔ علماء نے ہمیشہ ایسے افکار کا تعاقب کیا، اور امت کی درست رہنمائی کی، امت کو جدید اور انوکھے خیالات کے اثراتِ بد سے بچانے اور صراطِ مستقیم پر قائم رکھنے میں ہمیشہ اپنا کردار ادا کیا۔ اس میدان میں بانیِ جامعہ کا نام سرفہرست ہے، جن کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے جامعہ کے دیگر اہلِ علم نے بھی ہمیشہ جہاد بالقلم کا یہ سلسلہ جاری رکھا۔ اس لیے حضرت بنوریؒ نے دینی ادارہ کا قیام جن مقاصد کے پیشِ نظر کیا، ان میں ایک مغربی تہذیب وتمدن کے اثراتِ بد سے مسلمانوں کا بچانا اور الحادو بے دینی کے بڑھتے ہوئے اثرات کے آگے بند باندھنا بھی تھا، اس وجہ سے کراچی میں مدرسہ قائم کیا، اگر چہ جید وعلماء کرام جیسے مولانا عبدالرحمٰن کامل پوری رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو ملک کے کسی وسطی شہر میں مدرسہ بنانے کا مشورہ دیا، تو جواب میں ارشاد فرمایا: کراچی بین الاقوامی جگہ ہے، دارالحکومت ہونے کے ساتھ ساتھ فتنوں کی آماجگاہ بھی ہے، اس لیے کراچی میں بنانے کا خیال ہے۔ (۵) اسی بنا پر آپ نے ایسے نظریات کا کامیاب تعاقب کیا۔

علامہ مشرقی کی خاکسار تحریک اور ان کی کتاب ''التذکرۃ'' ہو، سنت اور حدیث کی حجیت سے انکار پر مشتمل غلام احمد پرویز کے نظریات اور ان کا ترجمان رسالہ طلوعِ اسلام ہو، یا پھر ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے جدید خیالات ونظریات اور اس کی پشت پر حکومت کی سرپرستی میں ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کی صدارت ہو، حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے جامعہ کے پلیٹ فارم سے ان تمام متجددانہ ومتجددانہ تحریکوں کا کامیاب تعاقب کیا۔ اس میدان میں حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے تساہل سے کام لیا نہ رواداری کو آڑے آنے دیا، یہاں تک کہ سیاست کے میدان میں امام الہند کے لقب کی صحیح حقدار ٹھہرنے والی شخصیت ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ جن کو علماء کا اعتماد بھی حاصل تھا اور شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے مشن کو عملی جامہ پہنانے میں مجاہدانہ کردار ادا کرنے والے علامہ عبیداللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ - جن کی شخصیت اور کارناموں پر بجا طور پر دیوبندی مکتبِ فکر کو فخر حاصل ہے- کی بعض تعبیرات اور خیالات کو جمہور علماء کے مؤقف سے جداگانہ محسوس کیا تو برملا اس پر نکیر فرمائی، جو اُن کی کتاب ''یتیمة البیان''میں مذکور ہے۔ (۶) ایسے میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے حوالے سے ان کا قلم کیوں جوش میں نہ آتا، جن کو علماء کی تائید وحمایت بھی حاصل نہیں تھی، اس لیے ''**الأستاذ المودودي و شيء من حیاته و أفکاره**'' کتاب تصنیف کی، اس کتاب کو عربی زبان میں لکھنے کا داعیہ یوں پیدا ہوا کہ برصغیر میں تو اُن کے نظریات اور عبارات پر کافی لکھا جا چکا تھا، علماء عرب کو اصل صورتِ

حال سے آگاہ کیا جائے، بالخصوص عصمتِ انبیاءؑ اور عدالتِ صحابہؓ کے حوالے سے، ابھی دو ہی اجزاء مکمل ہوئے تھے کہ داعیِ اجل کو لبیک کہی، اگر یہ سلسلہ جاری رہتا تو متعدد اجزاء منصۂ شہود پر آتے۔(۷)

فتنۂ قادیانیت کا تعاقب

جس نئی تحریک نے برصغیر پاک و ہند اور پورے عالم اسلام کی اساس کو متزلزل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا، وہ ختم نبوت کا قضیہ تھا، جس کی پشت پر قادیانیت کی تحریک تھی، اس تحریک کا راستہ روکنے کی کوششیں تو آغاز ہی سے شروع ہوئی تھیں، جس کے سرخیل مولانا امداد اللہ مہاجر مکیؒ اور مولانا قاسم نانوتویؒ تھے۔ آپ کے استاذ مولانا کشمیریؒ نے اس فتنے کی سرکوبی کے لیے کئی معرکۃ الآراء کتابیں تصنیف فرمائیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے شاگردِ رشید، بانیِ جامعہ نے تحریر وتقریر کے ذریعے فتنے کی سرکوبی کی کوششیں جاری رکھیں۔ عالمِ اسلام کے حکمرانوں کے نام خطوط لکھے، کانفرنسوں اور شخصی ملاقاتوں میں اس جماعت کے نظریات اور ملتِ اسلامیہ کے خلاف ان کی ریشہ دوانیوں سے پردہ اُٹھایا۔ جب تحریک کی کامیابی سے ہمکنار ہونے کے دن آئے اور ۱۹۷۴ء میں آئینی لحاظ سے قادیانی فرقہ کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا تو اس وقت تحریک کی قیادت بانیِ جامعہ کے ہاتھ میں تھی۔ آپ اس زمانے میں بیک وقت مجلسِ تحفظِ ختم نبوت کے امیر اور مجلسِ عمل کے صدر تھے۔ آئینی فیصلے اور دفعات پر مشتمل ایک تحریر اردو زبان میں ''ملتِ اسلامیہ کا موقف'' کے عنوان سے تیار کی، اپنی نگرانی میں اس کا عربی ترجمہ اپنے شاگرد ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر سے کرایا، ملتان، مصر اور کراچی میں متعدد بار چھپوایا۔(۸) جدید اور منحرف نظریات کے تعاقب کے مشن کو آپ کے جانشینوں نے بھی جاری رکھا۔ ان کوششوں کو تحریری شکل میں شائع کیا گیا۔

ماہنامہ ''بینات'' میں دورِ حاضر کے مفکر جاوید احمد غامدی کے نظریات کے بارے میں متعدد قسطوں میں تعاقب کیا گیا۔ صحابہ کرامؓ کی عظمت وتقدس کے حوالے سے اُٹھنے والی تحریکوں میں جامعہ کی طرف سے ہمیشہ یہ موقف اپنایا گیا کہ صحابہ کرامؓ اُمت کی عدول جماعت ہے، جن کا احترام اور تعظیم اُمت پر لازم ہے، ان کی تنقیص، تحقیر اور سب وشتم سے اسلام کی اساس منہدم ہوجائے گی۔

ان علمی اور تحقیقی سرگرمیوں کے معاشرے پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟! قادیانیت کے حوالے سے تو اُمت کا متفقہ مؤقف آئینی وقانونی حیثیت سے محفوظ ہوگیا، اور اسی کے نتیجے میں آج اس مسئلے پر دورائے نہیں، دیگر نظریات اور کوششوں کے بارے میں ایک سے زائد موقف ہو سکتے ہیں، تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ جناب مودودی صاحب کی جن عبارات اور نظریات پر تنقید کی گئی، ان کی جماعت نے کم از کم ان کا دفاع چھوڑ دیا، اور ان کی کتابوں سے ان کی قابلِ اعتراض عبارات خارج کر دی

گئیں، جو ایک مثبت اقدام ہے۔

رفاہی خدمات

یہ حقیقت کسی پر مخفی نہیں کہ جامعہ ایک علمی مرکز اور ادارہ ہے، جس کے کام کا دائرہ کار علمی سرگرمیوں تک محدود ہے۔ دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان علمی مراکز میں انسانیت کے ساتھ ہمدردی کا درس دیا جاتا ہے، جیسا کہ قرآن مجید کی متعدد آیاتِ کریمہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں وارد ہے۔ کوئی آسمانی یا زمینی آفت آجائے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اہلِ مدارس کو اس کا احساس نہ ہو، اور ان کے جذباتِ ہمدردی نہ اُبھریں۔ دوسری طرف آسمانی آفات کے وقت اصحابِ خیر مصیبت زدہ لوگوں کے ساتھ امداد کرنا چاہتے ہیں، لیکن ان کے لیے متاثرہ علاقوں میں پہنچ کر مصیبت زدہ لوگوں تک پہنچنے کا قابلِ عمل حل نہیں ہوتا، ایسے میں وہ چاہتے ہیں کہ معتمد اشخاص اور ذرائع ان کی امداد ان علاقوں میں پہنچادیں۔ اہلِ مدارس پر عوام الناس کا اعتماد ہوتا ہے، ان کو یقین ہوتا ہے کہ ان کے اموال مصیبت زدہ اور مستحق لوگوں تک پہنچ پائیں گے، نیز شرعی اصولوں کے مطابق تقسیم بھی ہوں گے۔ جب ملکِ عزیز میں اور دنیا کے دیگر ممالک میں آسمانی آفات کا سلسلہ شروع ہوا، تو اہلِ خیر حضرات کی بڑی تعداد نے جامعہ کا رُخ کیا اور جامعہ کے اربابِ حل وعقد سے درخواست کی کہ آپ ہمارے اموال مستحقین تک پہنچانے کا انتظام کریں۔ جامعہ نے اپنے فضلاء، طلباء اور مصیبت زدہ علاقوں کے اہلِ مدارس کے ذریعے امداد پہنچانے کا آغاز کیا۔ مفتی محمد عاصم زکی (مدرسِ جامعہ) اور مولانا امداد اللہ (ناظمِ تعلیماتِ جامعہ) کی نگرانی میں اساتذہ اور طلباء پر مشتمل ایک ٹیم تشکیل دی گئی، جس نے متاثرہ علاقوں میں جاکر سروے کیا، اپنے فضلاء سے رابطہ کیا، فہرستیں مرتب کیں اور نقدی، اشیاء خوردونوش، مکانات کی تعمیر، اجتماعی شادیوں کی صورت میں امداد فراہم کی۔ ۲۰۰۵ء کے قیامت خیز زلزلے میں متاثرہ علاقوں کے مکینوں کو امداد فراہم کی گئی، اجتماعی شادیاں کرواکر لوگوں کے گھر آباد کیے گئے۔ سوات اور بونیر کے بے گھر ہونے والے خاندانوں کے ساتھ مالی تعاون کیا گیا۔ طوفانی بارشوں اور سیلابوں کے نتیجے میں بے گھر ہونے والے مصیبت زدہ لوگوں کے ساتھ مدد کی گئی، مکانات تعمیر کرائے گئے۔

خلاصۂ بحث

۱:- دینی تعلیم کی تدریس وتعلیم کا سلسلہ عہدِ رسالت سے چلا آرہا ہے جس کا نصاب، طریقہ تدریس، نظامِ تربیت اور درکار ضرورتیں اور سہولتیں مقصد اور روح کے اعتبار سے ایک ہیں۔

۲:- ایسٹ انڈیا کمپنی کی برصغیر میں آمد سے قبل مدارس ومکاتب کے نظام چلانے کے لیے وقف کا ادارہ قائم تھا، کچھ اہلِ خیر حضرات کی طرف سے باقاعدہ وظائف جاری تھے، ۱۸۳۵ء کے

قانون کے نتیجے میں یہ نظام یکسر موقوف ہوگیا اور جاری نظامِ مدارس ختم ہوگیا۔

۳:- اصحابِ عزیمت علماء نے مسلمان عوام کی مدد سے ایسے مدارس کے قیام کی کوششیں شروع کیں جن میں خالص دینی علوم کو پڑھایا جارہا ہو۔

۴:- جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے بانی انہی مدارس کے فیض یافتہ تھے اور آپ ایک متبحر عالم کے طور پر ان مدارس سے منسلک رہے۔

۵:- ۱۹۵۱ء میں پاکستان منتقل ہوئے اور ۱۹۵۶ء میں مدرسہ عربیہ کے نام سے ایک ادارے کی بنیاد رکھی، بعد میں اس ادارے کا نام جامعۃ العلوم الاسلامیہ رکھا گیا جس میں دینی علوم کی تدریس اور اشاعت کے لیے ایک مؤثر نصاب، نظامِ تعلیم اور نظامِ تربیت وضع کیا گیا۔

۶:- انتظام و انصرام کے اعتبار سے جامعہ کے چار ادوار ہیں، اس وقت چوتھا دور جاری ہے، قیام سے لے کر اب تک اس تمام عرصے میں جامعہ نے ہر حوالے سے اپنی کارکردگی مزید مؤثر بنائی ہے اور خدمات کو وسعت دی ہے۔

۷:- جامعہ کی خدمات سے اسلامی معاشرے کی تشکیل اور اسلامی شناخت کی بقاء کے حوالے سے مثبت اثرات مرتب ہوئے، جامعہ کی خدمات کے اثرات کا دائرہ کار تمام اسلامی و غیر اسلامی ممالک تک وسیع ہے۔

تجاویز

۱:- حکومت وقت کو چاہیے کہ ملکی آئین اور قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے جامعہ اور تمام دیگر مدارس کے موجودہ نظامِ تعلیم و تربیت کو تحفظ فراہم کرے، اس میں رکاوٹیں نہ ڈالے اور کسی بھی بیرونی یا اندرونی دباؤ کے تحت مدارس کے نصاب اور نظام میں تبدیلی نہ لائے، اور اربابِ مدارس کے ساتھ بیٹھ کر اُن کی مشکلات کو حل کرے۔

۲:- جامعہ کے اربابِ حل و عقد عصری تقاضوں کے پیشِ نظر فضلاء مدارس کی استعداد اور صلاحیتوں کو مزید نکھاریں۔ اردو، عربی اور انگریزی زبانوں میں ان کی مہارت کو مزید بڑھائیں، تاکہ ان کا کردار معاشرے میں مزید وسیع اور مؤثر ہوجائے۔

۳:- سرکاری جامعات (یونیورسٹیز) اور جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن جیسے تمام بڑے مدارس کے درمیان مشترکہ علمی سرگرمیاں جاری رکھنے کے لیے مفاہمتی یادداشتیں تیار کرنے اور مدارس و سرکاری اداروں کے درمیان قائم ہونے والی خلیج کو کم کرنے کے لیے طلباء کو ایک دوسرے کے تجربات اور علمی سرگرمیوں سے استفادہ کرنے کا موقع فراہم کردینا چاہیے۔ اس مقصد کے حصول کے

لیے وفاق المدارس اور ایچ.ای.سی کو اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔

..... ✾ ..... ✾ ..... ✾ ....

حواشی وحوالہ جات

۱: - بشکریہ جناب مولانا ڈاکٹر منتظر شاہ صاحب، ناظم دفتر جامعہ اسلامیہ، بابوزئی

۲: - یہ معلومات جناب مولانا ڈاکٹر محمد شعیب، ناظم تعلیمات جامعہ اسلامیہ بابوزئی نے فراہم کیں، فجزاہ اللہ أحسن الجزاء

۳: - جامعہ اسلامیہ، لوساکا، زامبیا کا راقم نے خود بھی مشاہدہ کیا ہے، مولانا امداد اللہ صاحب ناظم تعلیمات جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن نے بھی جامعہ اسلامیہ زامبیا کا متعدد بار دورہ کیا اور حالات مشاہدہ کیے۔

۴: - الشیخ محمد انور بدخشانی، فی حوار شامل معہ المجلۃ مجلۃ وفاق المدارس، (ربیع الاول ۱۴۳۹ھ- دسمبر ۲۰۱۷ء) صفحات: ۲۴ تا ۲۷

۵: - ماہنامہ بینات، اشاعت خاص (۱۹۷۸ء) ص: ۲۳۵

۶: - بنوری، محمد یوسف، العلامہ، یتیمۃ البیان فی علوم القرآن (کراچی)

۷: - مختار، مقدمہ معارف السنن (۱۹۸۱ء)، جلد: ۱، ص: ۳۰

۸: - مختار، مقدمہ معارف السنن (۱۹۸۱ء) جلد: ۱، ص: ۳۴

ایصالِ ثواب کی درخواست

جامعہ کے شعبہ حفظ کے سابق استاذ اور اقرأ روضۃ الاطفال ٹرسٹ کے مدرس جناب قاری محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ ۱۴ ذوالقعدہ ۱۴۴۰ھ مطابق ۱۸ جولائی ۲۰۱۹ء بروز جمعرات کو ۵۲ سال کی عمر میں کراچی میں انتقال فرما گئے۔ إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون، إن للّٰہ ما أخذ ولہٗ ما أعطٰی وکل شیء عندہٗ بأجل مسمّٰی. أللّٰھم اغفرلہٗ وارحمہ وعافہٖ واعف عنہ وأکرم نزلہٗ ووسع مدخلہٗ.

حضرت قاری صاحبؒ نے پوری زندگی قرآن مجید کی خدمت کرتے ہوئے گزاری۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی جملہ دینی خدمات اور حسنات کو قبول فرمائے، کامل مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے، آمین بجاہ النبي الأمي الکریم صلی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وصحبہٖ أجمعین.

قارئینِ بینات سے قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے لیے ایصالِ ثواب اور دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔ واللّٰہ لایضیع أجر المحسنین.

المیزان انویسٹمنٹ میں سرمایہ کاری کرنا

(اسلامک میوچل فنڈز اور اسٹاک مارکیٹ کے شیئرز کا حکم)

ادارہ

کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ:

میرا نام ذیشان اللہ ہے اور میں ایک مقامی دواساز کمپنی میں ملازمت کرتا ہوں۔ میری بہت معقول تنخواہ ہے اور اس میں ہر سال کمپنی کی طرف سے اضافہ بھی ہوتا ہے۔ میری اس تنخواہ میں سے ہر مہینے انکم ٹیکس کٹتا ہے جو کمپنی خود کاٹ کر حکومت کے ادارے F.B.R کو جمع کرادیتی ہے۔ حکومت کے قانون کے مطابق جس کی جتنی زیادہ تنخواہ ہوتی ہے اس کا اتنا ہی زیادہ ٹیکس کٹتا ہے۔ چونکہ میری تنخواہ زیادہ ہے، اس وجہ سے میری تنخواہ کا تقریباً ۲۵٪ (پچیس فیصد) انکم ٹیکس کی مد میں کٹتا ہے اور حکومت کو جمع ہوجاتا ہے۔

حکومتِ پاکستان نے سن ۲۰۰۱ء میں ایک انکم ٹیکس آرڈیننس جاری کیا جس کے مطابق اگر کوئی ملازمت پیشہ یا کاروباری فرد کسی جگہ اپنے پیسے لگائے (investment) تو حکومت کی جانب سے ٹیکس میں کمی ہوگی اور حکومت اس کو انکم ٹیکس میں کچھ چھوٹ دے گی۔

عرض یہ ہے کہ چونکہ میری تنخواہ کا ایک اچھا خاصہ حصہ (پیسے-Amount) انکم ٹیکس میں کٹتے ہیں، اس لیے میں حکومت کی اس پیشکش سے فائدہ اُٹھانا چاہتا ہوں اور اپنے پیسے invest کرنا چاہتا ہوں۔ اس وقت پاکستان میں بہت سے ادارے ہیں جو اس طرح کی سرمایہ کاری کا کام کرتے ہیں، ان میں سے شرعی اور غیر شرعی ادارے دونوں ہیں۔ میں اپنے پیسے ''المیزان انویسٹمنٹ'' میں لگانا چاہتا ہوں جو کہ دارالعلوم کورنگی (مفتی تقی عثمانی صاحب) سے منظور شدہ ہے۔ المیزان انویسٹمنٹ والے ان اداروں میں پیسہ لگاتے ہیں جو کام شرعی طور پر درست ہیں جیسے تیل کی کمپنی، سیمنٹ بنانے والی کمپنی، بجلی

بنانے والی کمپنی وغیرہ۔ المیزان انویسٹمنٹ ان اداروں کے شیئرز (Shares) میں پیسے لگاتی ہیں جو اسٹاک ایکسچینج (Stock Exchange) میں ہوتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ:

۱:- کیا میرا حکومت کی مہیا کردہ سہولت لینا جائز ہے، جس میں اگر میں ''المیزان'' میں انویسٹ کروں تو میرا انکم ٹیکس کم کٹے گا اور مجھے حکومت کی جانب سے چھوٹ ملے گی؟

۲:- اس کے ساتھ ساتھ میری سرمایہ کاری جو ''المیزان انویسٹمنٹ'' میں کروں گا، اس کا مجھے نفع ملے گا۔ کیا یہ نفع میرے لیے شرعاً جائز ہے؟ چونکہ المیزان انویسٹمنٹ میں سرمایہ کاری کرنے سے میرا سرمایہ (Stock Exchange) اسٹاک ایکسچینج میں لگے گا جس میں نفع نقصان دونوں ہو سکتے ہیں، تو کیا یہ جائز ہوگا؟

۳:- اگر اس انویسٹمنٹ کا نفع میرے لیے شرعاً جائز نہیں ہوگا تو کیا میں صرف حکومت کی سہولت (جو کہ انکم ٹیکس کم ہونے کی صورت میں ہے) حاصل کرنے کے لیے یہ انویسٹمنٹ کر سکتا ہوں؟ اور جو نفع اس انویسٹمنٹ سے آئے اس کو میں نہ لوں یا پھر لے کر اپنے استعمال میں نہ لاؤں اور کسی ضرورت مند کو دے دوں تو جائز ہے؟ یا پھر یہ کام میں انکم ٹیکس کی سہولت کے لیے بھی نہیں کر سکتا؟

برائے مہربانی اس مسئلے میں میری رہنمائی فرمائیں۔ شکریہ

ذیشان اللہ، فیڈرل بی ایریا، کراچی

الجواب حامداً ومصلیاً

واضح رہے کہ مروجہ اسلامی میوچل فنڈز کے طریقہ کار کا خلاصہ یہ ہے کہ:

انویسٹر بطور مؤکل کے اپنی رقم فنڈز والوں کو پیش کرتا ہے۔ فنڈز والے انویسٹر کی رقم اور اس کی ضروریات کے مطابق مختلف شعبوں میں سے کسی ایک شعبہ کی طرف اس کی رہنمائی کرتے ہیں۔ فنڈز والے اس کی رقم کو بطور وکیل کے کل پانچ مدات میں لگاتے ہیں:

۱:- اسٹاک ایکسچینج

۲:- اسلامی بینکوں کے منافع بخش اکاؤنٹس

۳:- گوورنمنٹ کے صکوک

۴:- پرائیویٹ کمپنیوں کے صکوک

۵:-سونا اور چاندی کی مارکیٹ

اس خدمت کے عوض یہ ادارے فیس وصول کرتے ہیں۔ (بحوالہ فتویٰ نمبر: ۸۱۴۷، جاری شدہ از دارالافتاء جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی، مورخہ: ۱۳-۰۴-۱۴۳۸ھ، ۲۰۱۷-۰۱-۱۲ء)

ان اداروں میں سرمایہ کاری کے لیے شرعی حکم یہ ہے کہ اسلامی بینکوں کے منافع بخش اکاؤنٹس، اور صکوک میں سرمایہ کاری کرنا درست نہیں، اس لیے کہ اس میں ایسے طریقوں اور حیلوں کو استعمال کیا جاتا ہے جن کو اسلامی کہنا یا سود سے پاک کہنا درست نہیں۔

البتہ پہلی مد جس میں کہ یہ ادارہ اسٹاک ایکسچینج میں سرمایہ کاری کرکے شیئرز کی خرید وفروخت کرتا ہے، اس میں کاروبار کرنے کے لیے شیئرز کے کاروبار کے سلسلے میں جو شرائط بیان کی جاتی ہیں ان کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔ ان شرائط کا خلاصہ یہ ہے کہ:

۱:-کمپنی کا اصل کاروبار حلال ہو، سودی کاروبار یا ممنوعہ چیزوں کا کاروبار نہ ہو۔

۲:-کمپنی کی غالب آمدنی حلال ہو۔

۳:-جب تک مشتری کے پاس شیئرز کا قبضہ نہ آئے تب تک اس کو آگے نہ بیچے۔ اور موجودہ زمانے کے قبضہ کے لیے ضروری ہے کہ سی ڈی سی کے اکاؤنٹس میں شیئرز مشتری کے نام منتقل ہو جائیں۔

۴:-شیئرز کی شارٹ سیل (یعنی مشتری کی ملکیت میں شیئر آنے سے پہلے آگے بیچنا) اور فارورڈ سیل (یعنی بیع کو مستقبل کے زمانے کی طرف نسبت کرنا) نہ کی جائے۔

۵:-اس کمپنی کے شیئرز کی مارکیٹ ویلیو مائع اثاثوں جیسے نقد کی قیمت سے زیادہ ہو۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر مذکورہ میوچل فنڈز والے ان شرائط کا لحاظ کرتے ہوں تو سائل کے لیے اس ادارے کے شیئرز کی خرید وفروخت والے حصہ میں سرمایہ کاری کرنے کی گنجائش ہوسکتی ہے، مگر فی زمانہ اسٹاک مارکیٹ میں شیئرز کے کاروبار کے لیے بیان کردہ شرائط کا لحاظ نہیں رکھا جاتا، شرائط کے ساتھ اسٹاک ایکسچینج کے کاروبار کو جائز بتانے والے فتاویٰ کو صرف بیانِ جواز کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، شرائط کے لحاظ کی کوئی ضمانت یا یقین دہانی نہیں ہوتی، اس لیے اسٹاک ایکسچینج کے کاروبار کے جواز کا فتویٰ مشکل ہو رہا ہے۔

لہٰذا اسٹاک مارکیٹ کے شیئرز کی خرید وفروخت سے وابستہ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے معاملات میں درج بالا شرائط کی موجودگی کی مکمل یقین دہانی حاصل کریں یا پھر اسٹاک مارکیٹ کے

کاروبار سے علیحدہ رہیں:

’’**فنقول من حکم المبیع إذا کان منقولا أن لایجوز بیعہٗ قبل القبض إلٰی أن قال وأما إذا تصرف فیہ مع بائعہٖ فإن باعہٗ منہ لم یجز بیعہ أصلا قبل القبض.**‘‘ (الفتاوی الہندیۃ: ج:۳،ص:۱۳،الفصل الثالث فی معرفۃ المبیع والثمن والتصرف)

’’**قال العلامۃ ابن عابدینؒ: وھو لایصح بہ القبض ..... وقید بالقبض لأن العقد فی ذاتہٖ صحیح غیر أنہٗ لایجب علی المشتری دفع الثمن لعدم القبض.**‘‘ (ردالمحتار: ج:۴،ص:۴۸،مطلب اشتری دارا ماجورۃ لا یطالب بالثمن قبل قبضہا)

’’**آکل الربا وکاسب الحرام أھدی إلیہ أو أضافہ، وغالب مالہ حرام لا یقبل ولایأکل ما لم یخبرہ أن ذٰلک المال أصلہٗ حلال ورثہٗ أو استقرضہٗ، وإن کان غالب مالہٖ حلالا لا بأس بقبول ھدیتہٖ والأکل منھا.**‘‘ (ہندیۃ، کتاب الکراہیۃ، الباب الثانی عشر: فی الہدایا والضیافات، قدیم زکریا دیوبند، ج:۵،ص:۳۴۳، جدید زکریا دیوبند، ج:۵،ص:۳۹۷)

’’**غالب مال المھدي إن کان حلالا لا باس بقبول ھدیتہٖ وأکل مالہٖ ما لم یتعین أنہٗ من حرام، وإن کان غالب مالہ الحرام لا یقبلھا ولا یأکل إلا إذا قال: إنہٗ حلال ورثہٗ أو استقرضہٗ.**‘‘ (بزازیۃ علی ہامش الہندیۃ، الکراہیۃ، الفصل الرابع: فی الہدیۃ والمیراث، قدیم زکریا دیوبند، ج:۶،ص:۳۶۰، جدید زکریا دیوبند، ج:۳،ص:۲۰۳)

’’**وفی عیون المسائل: رجل أھدی إلٰی إنسان أو أضافہٗ إن کان غالب مالہٖ من حرام لا ینبغی أن یقبل ویأکل من طعامہٖ ما لم یخبر أن ذلک المال حلال استقرضہٗ أو ورثہٗ، وإن کان غالب مالہٖ من حلال فلا بأس بأن یقبل الھدیۃ ویأکل ما لم یتبین لہٗ أن ذٰلک من الحرام.**‘‘ (الفتاوی التاتارخانیۃ، الکراہیۃ، الفصل السابع عشر: فی الہدایا والضیافات، مکتبہ زکریا دیوبند، ج:۱۸،ص:۱۷۵، رقم: ۲۸۴۰۵، مجمع الانہر، کتاب الکراہیۃ، فصل فی الکسب، ج:۴،ص:۱۸۶، دار الکتب العلمیۃ، بیروت)

فقط واللہ اعلم

کتبہ

محمد عمر رفیق

متخصص فقہ اسلامی

جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

الجواب صحیح

محمد عبدالقادر

الجواب صحیح

ابوبکر سعید الرحمٰن

الجواب صحیح

مفتی رفیق احمد بالاکوٹی

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

نقد و نظر

ارشاد السلوک

ادارہ

افادات: حضرت مولانا خان بہادر مارتونگیؒ (المشہور بہ مارتونگ بابا) (متوفی:۱۹۷۶ء)۔ صفحات:۹۴۔ قیمت: درج نہیں۔ ناشر: مولانا سحبان، مدرسہ اسماءؓ للبنات، گارڈن ویسٹ، کراچی

زیرِ تبصرہ کتاب علاقہ مارتونگ ضلع سوات کے ایک متبحر عالم اور صوفی بزرگ حضرت مولانا خان بہادر رحمۃ اللہ علیہ - جو مارتونگ بابا کے لقب سے معروف ہیں- کے سلوک وطریقت اور تصوف سے متعلق افادات وارشادات پر مشتمل ہے۔ کتاب کے مرکزی عنوانات اور مضامین درج ذیل ہیں:

''۱:-حضرت العلامۃ خان بہادرؒ (المشہور بہ مارتونگ باباؒ) کا تذکرہ۔۲:-مقدمہ ''شریعت وطریقت کا تلازم'' از شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریاؒ، ''تصوف کیا ہے؟'' از مولانا محمد منظور نعمانیؒ۔۳:-فصل اول: طریقۂ قادریہ کا بیان۔۴:-فصل دوم: طریقۂ نقشبندیہ کے اسباق کے بیان میں۔۵:-تتمہ: اشغالِ نقشبندیہ عالیہ مجددیہ۔ ۶:-فصل سوم: طریقۂ چشتیہ عالیہ کے اسباق کا بیان۔ فصل چہارم: بیان سلسلہ ہائے طریقہ قادریہ غفوریہ ونقشبندیہ عالیہ مجددیہ وچشتیہ۔''

کتاب کی افادیت ومعنویت مضامین سے واضح ہے۔ اہلِ سلوک کے لیے اس کتاب میں بیش بہا خزانہ ہے۔ معنوی خوبیوں کے ساتھ ظاہری خوبیوں سے بھی مزین ہے۔ کاغذ اعلیٰ اور طباعت دو رنگی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کتاب کا نفع عام فرمائے اور ناشر کو جزائے خیر عطا فرمائے، آمین

راہزن (نواں ایڈیشن)

مولانا محمد طیب طوفانی۔ صفحات: ۱۴۸۔ قیمت: درج نہیں۔ ناشر: الحسن اکیڈمی، سرائے نورنگ، ضلع لکی مروت۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں غلام احمد پرویز، ڈاکٹر ذاکر نائیک، گوہر شاہی، زید زمان حامد، جاوید احمد غامدی جیسے لوگوں کے گمراہ کن عقائد کی بیخ کنی شہیدِ اسلام حضرت لدھیانوی شہیدؒ اور دیگر حضرات اکابر علمائے کرام کے افادات کے تناظر میں کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ''عقیدہ ختم نبوت... چند ایمان افروز واقعات'' کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ یہ کتاب پہلے بھی چھپی تھی، لیکن اس کا پوائنٹ سائز کم تھا، اب اس پوائنٹ سائز کو تو بڑھا دیا گیا ہے، لیکن کتاب کا کاغذ بالکل ناقص ہے۔